188677

UNIVERSAL
LIBRARY
OU_188677
UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۹۲۳۶ ا   Accession No. ۱۲۵۳۳

Author ابوالکلام آزاد   آ - ج

Title چیدہ تحقیقن

This book should be returned on or before the date last marked below.

چیدہ شخصیتیں

چیدہ شخصیتیں

ابوالکلام آزاد

کتب خانہ
... آباد

ناشر:-

مکتبہ عزیزیہ بہاول پور

بار اول　　　　قیمت ۳/　　　　تعداد ۱۰۰۰

محمد حفیظ الرحمٰن حفیظ مالک مکتبہ عزیزیہ نے اپنے عزیز المطابع بہاولپور سے چھپا کر شائع کی۔

فہرس

والٹیر	۹
جان جاک روسو	۲۱
نپولین	۵۰
رستم بن رضا	۷۱
سید جمال الدین اسد آبادی	۸۳

سعد پاشا زغلول	۹۱
مصطفیٰ فاضل پاشا	۱۳۳
مدحت پاشا	۱۶۳
کیپٹن ویبسٹر	۲۳۵
دیش بندھو چترنجن داس	۲۴۳

پیش لفظ

اب تو یہ کہنے کی بھی حاجت نہیں رہی۔ کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے قلم کی ایک بے پرواہ جنبش بھی مخاطب کے دل کو کھینچے بغیر نہیں رہتی حقیقت یہ ہے کہ مولانا کو جیسا دماغ قدرت کی طرف سے ودلیعت ہوا، ویسا دماغ صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ موجودہ وقت میں عوام و خواص، عام اس سے کہ وہ مولانا کے سیاسی مسلک سے اختلاف رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں۔ لیکن تحریر کی جادو بیانی نے سبھوں کو اپنے حلقۂ دام میں بری طرح گرفتار کر رکھا ہے۔ شاذ ہی ایسا ہوگا۔ جو عقلِ سلیم نہ رکھنے کی وجہ سے مولانا کی تحریر و تقریر کا قائل نہ ہو۔ ورنہ مخالف موافق، چھوٹے بڑے، عالم فاضل، ۔۔۔ غرضکہ ہر ایک کا دل مولانا کی درازیِ عمر کے لئے دعا گو ہے۔

دنیا میں ایسے لوگ بہت کم ملیں گے۔ جو تنقید کرتے وقت شخصیت پرستی یا ہٹ دھرمی کے جذبات سے متاثر نہ ہوں۔ لیکن مولانا کا شمار ایسی پاک ہستیوں میں ہے۔ جو کسی سے للہی کد یا عداوت نہیں رکھتی۔ اگر کسی کی حمایت ہے۔ تو محض اسلئے کہ وہ حق پر ہے۔ اور اگر کسی کی مخالفت ہے۔ تو محض اس کی برائیوں کی وجہ سے۔ اس میں خواہ ان کے اعزہ اور احباب ہی کیوں نہ شامل

ہوں۔ وہ تنقید کرتے وقت اپنایت کا خیال ہرگز نہ کریں گے۔

اسی طرح اپنے ہم مذہبوں کے علاوہ غیر مسلموں کے ممتاز اکابر کے بارے میں بھی رائے قائم کرتے وقت وہ کسی ایسے جذبے سے متاثر نہ ہوں گے جو اُن کی صحیح تنقید کا رنگ بدل دے۔

مولانا نے الہلال کے متعدد پرچوں میں ہندو مسلم اور عیسائی اکابر کے متعلق ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ جو ایک عرصے تک قائم رہا۔ اور ان شخصیتوں پر مضامین لکھ کر مولانا نے ان خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے جو اُن کی شخصیت کی بڑائی ثابت کرے۔ امید ہے۔ یہ مضامین پسند کئے جائیں۔ اور چند شخصیتوں کے اخلاق و کردار جن کا ذکر اس کتاب میں موجود ہے۔ ہماری زندگی کے پہلوؤں پر اچھا اثر ڈالے گا۔

(مرتب)

والٹیر

ایک دن والٹیر مشہور رقاصہ روانیل کے ساتھ اُس کی گاڑی میں بیٹھا تھا۔ رقاصہ تھیٹر جارہی تھی۔ جہاں اُسے والٹیر کے شہرۂ آفاق ڈراما "میروپ" کی مشق کرنا تھی وہ بہت پریشان تھی۔ کہنے لگی "کامیابی کے ساتھ یہ ڈراما اور اُس کے دقیق جذبات دکھانے کے لیئے ضروری ہے۔ کہ میرے جسم میں شیطان حلول کر جائے
"سچ ہے بیگم! ہر فن میں کامیابی اسی پر موقوف ہے۔ کہ شیطان جسم میں حلول کر جائے۔" والٹیر کا جواب تھا!

والٹیر کے تمام دشمنوں نے خصوصاً کلیسائی حریفوں نے بیک زبان کہا ہے کہ شیطان اس کے اندر حلول کیئے تھا۔ چنانچہ سینٹ بوف کا قول ہے "ابلیس اُس کے جسم میں تھا" رویسٹر کہتا ہے۔ "یہ شخص، جہنم کی تمام قوتوں اور حیلوں کا مالک تھا!"

دراصل والٹیر اپنے وقت کا پورا آدمی تھا۔ یورپ کی اٹھارویں صدی کی ادبیات کی سچی تصویر اس فلسفی شاعر میں ہم دیکھ سکتے ہیں۔ اس کی تصانیف میں اُس کی جملہ بھلائیاں اور برائیاں، دونوں جمع ہوگئی ہیں۔ کبھی وہ نہایت مزموم، کج خلق، بداطوار، فحاش، بے اصول، مفرط، اور کمینہ نظر آتا ہے

کبھی از حد لطیف، مہذب، سنجیدہ، با اصول، فیاض اور دوستوں کا وفادار دکھائی دیتا ہے۔ کبھی اپنے دوستوں پر جان و مال قربان کرنے پر تلا ہے کبھی دشمنوں کو پاؤں سے روند ڈالنے پر اڑا ہے۔ والٹیر ایسی ہی متناقض صفات و اخلاق کا مجموعہ ہے!۔

لیکن یہ صفتیں اس کی شخصیت کی اصلی بنیادیں نہیں ہیں۔ اُس کی شخصیت کے ستون جس چٹان پر قائم تھے، وہ اُس کی اعلیٰ دماغی قابلیت اور حیرت انگیز ذہانت تھی۔ ثبوت کے لئے کسی تاریخی شہادت کی ضرورت نہیں۔ اس کی کتابیں خود سب سے بڑی شہادت ہیں۔ ننانوے ضخیم جلدیں اس کی یادگار ہیں۔ اُن کا ہر صفحہ روشنی کے حرفوں میں لکھا ہے۔ ہر سطر اپنی جگہ پر ایک کامل سحر ہے۔ اتنی بڑی اتنی کثیر، اتنی متنوع کتابیں، کم لوگوں نے چھوڑی ہیں۔ وہ معلومات و مباحث کی وسعت و تنوع کے لحاظ سے انسائیکلوپیڈیا کا حکم رکھتی ہیں۔ تاہم حشو و زوائد بہت کم ہیں۔

خود والٹیر کا قول ہے "میرا پیشہ یہ ہے۔ کہ جو کچھ میرے ذہن میں آئے۔ اُسے کہہ ڈالوں۔ زندگی بھر اس نے اسی پر عمل کیا۔ لیکن اس کے ذہن میں ہمیشہ وہی آتا تھا۔ جو کہنے کے لائق ہوتا تھا۔ لغو افکار سے اس کا دماغ بالاتر تھا۔ اس کی سب سے بڑی مہارت یہ تھی۔ کہ ہر خیال کو ایسے پیرایہ میں ادا کر دیتا۔ تھا۔ کہ سامعین وجد کرنے لگتے تھے!

والٹیر کی سب سے زیادہ مؤثر دلچسپ، اور عجیب تحریریں وہ ہیں۔ جو اُس نے مسیحی کلیسا کے خلاف لکھی ہیں۔ معلوم ہے۔ کہ اُس نے مسیحی کلیسا کے

جمود اور تعصب کے خلاف (خود اس کے لفظوں میں) جنگ مقدس (کروسیڈ) کا اعلان کیا تھا۔ اِن تحریروں میں اُس نے فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیئے ہیں لفظ اور سطریں نہیں ہیں، جرار فوجیں ہیں۔ جو حملہ آور ہو رہی ہیں۔ درحقیقت مسیحی کلیسا کے ہزار سالہ تختِ حکومت کے پائے اسی کے نوکِ قلم سے ٹوٹے، اور اس طرح ٹوٹے کہ پھر کسی طرح بھی استوار نہ ہو سکے!

والیٹر کی شہرت صرف اس کی کتابوں اور قصیدوں ہی سے نہیں ہوئی۔ بلکہ وہ بہت بڑا مقرر اور لسان بھی تھا۔ انہیں مختلف قابلیتوں کے مجموعہ نے اسے اپنے زمانہ کا سب سے بڑا آدمی بنا دیا!

والیٹر غضب کا محنتی تھا۔ کام سے کبھی نہیں تھکتا۔ یہی سبب ہے۔ کہ وہ اتنا بڑا علمی ذخیرہ چھوڑ گیا۔ جتنا اس کے کسی ہم عصر کے امکان میں نہ تھا۔ اُس کی غیر معمولی چستی کے ثبوت میں خود اُس کے بہت سے اقوال پیش کئے جا سکتے ہیں۔ وہ کہتا ہے:-

"سستی اور عدم ایک چیز ہے۔"

ایک اور جگہ لکھتا ہے:-

تمام آدمی اچھے ہیں، بجز اُن کے، جن کے پاس کرنے کے لئے کوئی کام نہیں!"

اُس کے سکرٹری کا بیان ہے:-

والیٹر بڑا بخیل تھا۔ صرف اپنے وقت میں بخل کرتا تھا۔ اُس کا مشہور مقولہ ہے:-

زندگی کے مصائب کم کرنے کے لئے نفس کو ہمیشہ زیادہ سے زیادہ کام میں مشغول رکھنا چاہیئے . . . . میری عمر جتنی زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ محنت کی ضرورت کا اتنا ہی زیادہ یقین ہوتا جاتا ہے۔ جو شخص محنت کا عادی ہو جاتا ہے،

اُسے محنت میں اتنی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ کہ زندگی کی تمام کلفتیں بھول جاتا ہے"

اس کا یہ قول ضرب المثال ہوگیا ہے :۔

"اگر خودکشی منظور نہیں ہے۔ تو اپنے لئے کوئی کام پیدا کرلو"۔ اسی جملہ سے لوگوں نے خیال کیا ہے۔ کہ اس کے دل میں خودکشی کا خیال پیدا ہوا کرتا تھا۔ اسی لئے وہ ہمیشہ کام میں منہمک رہتا تھا۔

اٹھارھویں صدی کی رُوح

دیکٹر ہیوگو کا قول ہے :۔

"والٹیر اور اس کی رُوح کا سمجھ لینا پوری اٹھارھویں صدی کی رُوح کا سمجھ لینا ہے۔"

اٹلی ایک بڑی تہذیب کا منبع تھا۔ جرمنی سے اصلاح دینی کا سرچشمہ پھوٹا لیکن فرانس پہ تو فرانس میں والٹیر تھا۔ والٹیر ایک پوری قوم تھا۔ انقلابِ عظیم کی دعوت تھا۔ نہیں، سرتاپا انقلاب تھا۔ فرانس کا مشہور انقلاب، جس نے خون کی موجوں سے ایک نئی دُنیا پیدا کردی، والٹیر ہی کا ایک افسونِ حیات تھا۔ یہ شخص اپنے اندر سب کچھ رکھتا تھا۔ اُس میں "مونتین" کا شک تھا۔ "رابیلیہ" کا تمسخر تھا۔ "لوتھر" کی حملہ آورانہ قوت تھی۔ اسی نے میرابو، مورات، ڈانٹن، روبسپیر و پیدا کئے تھے۔ اور وہ بارود بنائی تھی۔ جس سے انہوں نے دُنیا کے تمام نظام ہائے قدیم کی عمارتیں بیک دفعہ ہوا میں اڑا دیں !"

لامارٹین کہتا ہے :۔

اگر انسان کا عمل اُس کی عظمت کا میزان ہے۔ تو بلاشک والٹیر موجودہ یورپ کا سب سے بڑا کاتب تھا۔ قدرت نے اُس کی عمر میں برکت دی۔ ۸۴ سال زندہ رہا۔

قدیم نظام کے معائب معلوم کئے، اس کے خلاف جہاد کیا اور جب مرا تو متحمد تھا۔"

کسی مصنف کو بھی اپنے عہد میں اتنا اقتدار حاصل نہیں ہوا، جتنا والٹیر نے حاصل کیا تھا۔ تمام جہان اُس کا مخالف تھا۔ کلیسا جو اُس وقت تک سب سے بڑی قوت تھی، دشمن تھا۔ حکومت خون کی پیاسی تھی۔ اُسے قید کیا گیا۔ جلا وطن کیا گیا۔ اُس کی کتابیں روکی گئیں، جلائی گئیں۔ حتیٰ کہ چھاپنے، بیچنے اور پڑھنے والوں تک کو سزا دی گئی۔ مگر والٹیر کے عزم وہمت میں فرق نہ آیا۔ وہ تمام دشمنوں پر غالب آیا۔ تمام مشکلات پر متحمند ہوا۔ اُس نے ہمیشہ حق و حقیقت کا اظہار کیا۔ اور بالآخر دُنیا کی گردنیں اُس کے علمی و عقلی جبروت کے آگے جھک گئیں۔ یا تو اُسے ذلیل سمجھا جاتا تھا یا پھر یہ ہوا کہ بادشاہ، شہنشاہ، اور روم کے پوپ تک، اُس کی خوشامدیں کرنے لگے۔ سب اُس کی ہیبت سے لرزا ٹھے۔ پاپاؤں کی روحانی گدی اور بادشاہوں کے زریں تخت ہلنے لگے۔ آدھی دنیا نے اس ساحر کے لئے اپنے کان کھول دئے۔ اور اس کی زبان و قلم کا ہر لفظ باشندگانِ یورپ کے دلوں میں اتر گیا!۔

والٹیر ایک ایسے زمانہ میں پیدا ہوا تھا جس کی سب سے بڑی ضرورت تخریب اور شکست و ریخت تھی۔ جرمنی کا نیتشے کہتا ہے "ہنسنے والے شیروں کے نمودار ہونے کی ضرورت ہے۔" والٹیر نے یہ نہیں کہا۔ مگر وہ سچ مچ کے شیر کی طرح گرجتا اور ہنستا ہوا اُٹھا اور قدیم نظام کی کہنہ عمارت ڈھادی۔ درحقیقت یورپ کی موجودہ بیداری اور تہذیب کا سہرا دو ہی آدمیوں کے سر ہے۔ والٹیر اور روسو۔ انہی دونوں نے انقلاب فرانس کی تخم ریزی کی، اور وہ سب کچھ مہیا کر دیا۔ جس کی اس انقلاب کو

ضرورت تھی۔ بدنصیب لوئی شانزدھم نے قتل ہونے سے چند دن پہلے قید خانہ میں والٹیر
اور روسو کی کتابیں دیکھی تھیں۔ وہ بے اختیار چلا اُٹھا۔ "انہی دو آدمیوں نے فرانس کو
برباد کیا ہے!" ظاہر ہے۔ کہ فرانس کی بربادی سے بدنصیب بادشاہ کا مقصود اپنے
خاندان کی بربادی تھی۔ نپولین اعظم کہا کرتا تھا "بوربون (فرانس کا خاندانِ شاہی) اپنا
تخت و تاج محفوظ رکھ سکتا تھا۔ اگر والٹیر اور روسو کا منہ بند کر دیتا" خود والٹیر
کہتا ہے "کتابیں ہی قوموں پر حکومت کرتی ہیں"۔ اسی کا مقولہ ہے "دماغی تربیت
سے بڑھ کر کوئی ذریعہ آزادی کا نہیں" ایک اور موقعہ پر اُس نے کہا "جب قوم سوچنے
لگ جائے۔ تو پھر منزلِ مقصود سے اُسے روکنا ناممکن ہو جاتا ہے" والٹیر کے ظہور
کے ساتھ فرانس نے سوچنا شروع کیا، اور دنیا کی کوئی قوت بھی اُسے آگے بڑھنے
سے روک نہ سکی۔

مختصر سوانح حیات

والٹیر کا اصلی نام "فرانسو ماری اوریہ" ہے۔ ۱۶۹۴ء میں پیرس میں پیدا ہوا۔ اُس کا باپ رجسٹرار تھا۔ اور
ماں ایک شریف گھرانے کی خاتون تھی۔ خیال کیا جاتا ہے۔ کہ والٹیر نے اپنی غصہ والی طبیعت
اپنے باپ سے ورثہ میں پائی تھی۔ اور ذہانت ماں سے۔ والٹیر کے پیدا ہونے میں اس کی
ماں کو اتنی تکلیف ہوئی۔ کہ جانبر نہ ہو سکی۔ وہ خود بھی از حد کمزور تھا۔ حتیٰ کہ اس کی
دائی نے گود میں لیتے ہی کہہ دیا تھا "بچہ ایک دن سے زیادہ نہیں جئے گا" لیکن اس
کا اندازہ غلط تھا۔ وہ ۸۴ سال تک زندہ رہا۔ البتہ بیماریوں اور جسمانی تکلیفوں میں
ہمیشہ مبتلا رہا۔

والٹیر کا ایک بڑا بھائی بھی تھا۔ اس کا نام ارمان تھا۔ لیکن وہ آزاد خیالی کے

جرم میں کلیسا کے حکم سے قتل کر ڈالا گیا تھا۔ تو بعض دوستوں نے رائے دی۔ تو یہ لکھ کے جان بچالے۔ لیکن یہ سنکر وہ بہت غضب ناک ہو گیا۔ اس نے کہا۔ "دوستو شکریہ۔ اگر تم خود پھانسی پر لٹکنا پسند نہیں کرتے۔ تو ان لوگوں کی راہ کیوں روکتے ہو۔ جو پھانسی پانا پسند کرتے ہیں؟"

والٹیر کا باپ اپنے دونوں لڑکوں کی شکایت کیا کرتا تھا۔ "خدا نے مجھے دو پاگل بیٹے دیئے ہیں۔ ایک کو نثر کا جنون ہے، دوسرے کو نظم کا" والٹیر نے شعر کہنا اس وقت سے شروع کیا۔ جبکہ وہ اپنا نام بھی صحیح طور پر نہیں لکھ سکتا تھا۔ اس کا باپ علمی زندگی کا عادی تھا۔ اس نے اپنے لڑکے کی یہ حالت دیکھ کر افسوس کے ساتھ یقین کر لیا کہ یہ بالکل ناکارہ نکلے گا۔ اسے کیا معلوم تھا، ایک دن اس کا یہی ناکارہ تمام یورپ کا سب سے بڑا اہل قلم تسلیم کیا جائیگا!

والٹیر کی ماں کے انتقال کے بعد اس کا خاندان پیرس چھوڑکر دیہات میں جا بسا یہاں ایک دولتمند فاحشہ نے والٹیر کو دیکھا۔ اور اس میں آثار ذہانت و نجابت پائے چنانچہ مرنے سے پہلے وہ یہ نیک کام کر گئی۔ کہ دو ہزار فرنگ والٹیر کو ہبہ کر دیئے تاکہ اس روپیہ سے اسے کتابیں خرید دی جائیں۔"

والٹیر کو ان کتابوں سے بڑا نفع ہوا۔ وہ عمر بھر اس آبرو باختہ عورت کا احسانمند رہا۔ اس کے بعد ایک راہب کو اس سے محبت ہو گئی۔ لیکن یہ راہب در اصل ملحد تھا۔ اس نے اسے شک و الحاد کی تلقین کی، اور کلیسا کے طرف سے نفرت و انکار دلنشین کر دیا۔

اس کے بعد وہ پادریوں کے مدرسہ میں دینی تعلیم حاصل کرنے کے لئے داخل کیا گیا

یہاں اُس نے فنِ مناظرہ اور علمِ کلام سیکھا۔ اُس وقت بڑا علمی کمال یہ سمجھا جاتا تھا کہ ایک ہی مسئلہ کو بہ زورِ جدل دو متناقض پہلوؤں سے ثابت کر دیا جائے۔ والٹیر نے اس فن میں کمال حاصل کر لیا۔ نتیجہ یہ نکلا۔ کہ کسی مسئلہ پر بھی اُسے یقین باقی نہ رہا۔ مدرسہ میں وہ بڑا محنتی طالب علم مشہور تھا۔ حتیٰ کہ فرصت کے اوقات میں بھی جبکہ اور لڑکے کھیل کود میں مصروف ہوتے، وہ اساتذہ سے لاہوتی مسائل پر بحث کیا کرتا۔ اپنی طالب علمانہ زندگی کے متعلق وہ کہا کرتا تھا "پادریوں نے مجھے لاطینی زبان اور بہت سی بیہودہ بکواس سکھا دی ہے!

تعلیم ختم کرنے کے بعد اُسے علمی دنیا کی طرف توجہ ہوئی۔ اور اپنے لئے کوئی پیشہ منتخب کرنا چاہا۔ اس نے اپنے باپ سے بلا پس و پیش کہہ دیا "میں شعر و ادب کو اپنا پیشہ بناؤنگا" باپ بہت خفا ہوا۔ اور بہت سمجھایا۔ مگر اُس نے ایک نہ سنی۔ اور اپنی ہٹ پر قائم رہا۔ لطف یہ ہے۔ کہ اس پیشہ کے متعلق خود اُس کی رائے یہ تھی "شعر و ادب اُن لوگوں کا مشغلہ ہے۔ جو اجتماعی زندگی میں بے فائدہ بننا اور اپنے عزیزوں اور دوستوں کے سر پر بوجھ ہونا چاہتے ہیں۔ یہ اُن لوگوں کا پیشہ ہے۔ جو بھوکوں مر جانا پسند کرتے ہیں۔"

۲۱ برس کی عمر تک والٹیر نے اپنے تئیں رندی و عیاشی کے لئے وقف کر رکھا تھا راتیں باہر گذارتا تھا۔ اور دن گھر پر۔

"ہمہ شب شراب خوردن ہمہ روز خواب کردن!"

اُس کے والد کو اس تہتک سے بڑی تکلیف تھی۔ اُس نے لاکھ کوشش کی مگر صلاح کی کوئی صورت نہ نکلی۔ آخر اپنے ایک سخت گیر رشتہ دار کے ہاں بھیجدیا۔ شروع

میں تو اس نئے مربی نے بڑی سختی کی۔ لیکن پھر اس کی غیر معمولی قابلیت و ذہانت دیکھ کر آزاد چھوڑ دیا۔ والد کو معلوم ہوا۔ تو اس نے واپس بلا لیا۔ اور ہالینڈ میں فرانسیسی سفیر کے حوالہ کر دیا کہ اپنی نگرانی میں رکھے۔ یہیں ہالینڈ کے پائے تخت لاہائی میں والٹیر نے ایک دوشیزہ سے عشق کیا۔ لیکن راز جلد کھل گیا۔ اور حضرت کو ہزاروں حسرتوں کے ساتھ بھاگنا پڑا۔ یہ اس کا پہلا عشق تھا اس لئے عمر بھر اس کی چبھن دل میں باقی رہی!"

۱۷۱۵ء میں والٹیر اپنے والد سے علیحدہ ہو کر پیرس پہنچا۔ اسی زمانہ میں لوئی چہاردہم نے انتقال کیا۔ اور لوئی پانزدہم تخت نشین ہوا۔ بادشاہ کمسن تھا۔ اس لئے سلطنت کی باگیں اس کے مربی فلیپ دو رلیں کے ہاتھوں میں آگئیں۔ یہ شخص کم ہمت اور ضعیف الارادہ تھا۔ ملک میں بدامنی پھیل گئی۔ پیرس اس کا مرکز تھا۔ والٹیر شورش پسندوں میں داخل ہو گیا۔ اور اپنی بیباکی اور جرأت کی وجہ سے بہت جلد ممتاز جگہ حاصل کر لی۔

اس کی جرأت کا اندازہ صرف اس ایک واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ نائب سلطنت نے کفایت شعاری کے خیال سے شاہی اصطبل کے آدھے گھوڑے بیچ ڈالنے کا حکم دیا تھا۔ اس پر والٹیر نے ایک مضمون میں لکھا: "کاش نائب سلطنت آدھے گدھوں کی فروخت کا بھی حکم صادر کر دیتے جو حکومت کی اونچی کرسیوں پر بیٹھے ہیں!"

حکام کی نظر سے یہ مضمون گزرا تو سخت برہم ہوئے۔ پھر نائب سلطنت کی ہجو میں دو قصیدے شائع ہوئے۔ اور خیال کیا گیا کہ والٹیر نے ہی لکھے ہیں۔ اب پوری حکومت اس کی دشمن ہو گئی۔ ایک دن کسی تفریح گاہ میں نائب سلطنت نے والٹیر کو دیکھا اور بلا کر کہا۔ "میں تم سے شرط باندھتا ہوں کہ میں تمہیں ایک ایسی

بھیج دونگا۔ جسے تمہاری ان آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھا ہے!" والٹیر نے تمسخر سے سوال کیا:" وہ کون جگہ ہو سکتی ہے؟ نائب نے کہا۔ باسٹل کی تاریک کوٹھڑیاں!"

اس گفتگو پر پورے چوبیس گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ والٹیر باسٹل کے خوفناک قیدخانہ میں بند تھا۔ یہ واقعہ ۱۷۱۷ء کا ہے۔ کاش اس وقت حکومت کو معلوم ہوتا کہ ایک دن یہی باسٹل والٹیر کے پیدا کردہ انقلاب کے ہاتھوں منہدم ہو کر رہے گا!"

اس وقت تک والٹیر اپنے اصلی نام " فرانسوا ماری اروید " سے مشہور تھا۔ لیکن قید ہونے کے بعد آیندہ حکومت کے شکنجہ سے بچنے کے لئے ایک فرضی نام اختیار کرلیا۔ جو والٹیر تھا۔ یہ فرضی نام اس درجہ مشہور ہوا۔ کہ آج تاریخ کے سوا کہیں بھی اس کا اصلی نام نہیں مل سکتا۔

قیدخانہ میں اس نے بڑی ہمت وجرأت سے کام لیا، اور اپنی شہرۂ آفاق کتاب "ہنریاڈ" تصنیف کی۔ یہ دراصل ہنری چہارم کا قصہ ہے۔ جو پہلے پروٹسٹنٹ ہوا تھا۔ پھر دوبارہ کیتھولک ہوگیا، اور آخرکار قتل کیا گیا۔"

قیدخانہ میں وہ گیارہ مہینے رہا اس اثنا میں اُسے سخت جسمانی تکلیفیں دی گئیں۔ لیکن بعد میں خود نائب سلطنت کو رحم آگیا۔ عزت کے ساتھ رہا کر دیا گیا۔ اور سالانہ وظیفہ بھی مقرر ہوگیا۔ والٹیر کی شوخ طبعی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اُس نے نائب سلطنت کو شکریہ کا خط

ان الفاظ میں لکھا تھا۔

اعلیٰ حضرت نے میرے رزق کا جو اہتمام کیا ہے، اس کے لیئے شکرگزار ہوں۔ مگر میری دست بستہ درخواست ہے کہ میری سکونت کے انتظام کرنے کی حضور کبھی جرأت گوارہ نہ کریں۔

اس کا اشارہ قید خانہ کی طرف تھا۔

باسٹل سے نجات پانے کے بعد والٹیر نے اپنا مشہور ڈراما "اوڈیپ" لکھا۔ یہ ایک نہایت ہی درد انگیز قصہ ہے۔ بہت مقبول ہوا۔ اور مسلسل ۴۵ دن تک پیرس کے تھیٹروں میں دکھایا گیا۔ والٹیر کے والد کو اس کا حال معلوم ہوا۔ تو خاص اس کے دیکھنے کے لئے پیرس آیا۔ تماشہ دیکھتے وقت اپنی مسرت بار بار یہ کہہ کر ظاہر کرتا۔ "آہ شیطان آہ شیطان!"

اسی ڈراما میں اس نے اپنے یہ انقلاب انگیز خیالات ظاہر کئے تھے:۔

"ہمارے کاہن ویسے نہیں ہیں۔ جیسا سادہ لوح عوام انہیں سمجھتے ہیں۔" ان کاہنوں کے علوم و معارف کیا ہیں؟ دراصل ہماری سادہ لوحی اور زود اعتقادی ہی اُن کے علوم و معارف ہیں!"

"ہمیں اپنی قوت پر یقین کرنا اور ایمان لانا چاہئے۔ ہر چیز خود اپنی آنکھوں سے دیکھنی چاہئے۔ درحقیقت ہماری عقل ہی ہمارا معبود، ہمارا عبادت خانہ اور ہمارا کاہن ہے۔"

اس ڈراما سے والٹیر نے چار ہزار فرانک حاصل کئے۔ اس نے یہ رقم

ضائع نہیں کی۔ بلکہ اُسے اپنا راس المال قرار دیا۔ اور بڑی ہوشیاری سے اُسے بڑھاتا رہا۔ اُس کا اصول تھا کہ آدمی کو اپنی روزی اپنی محنت سے کمانی چاہئیے اور اپنی کمائی سے کچھ نہ کچھ پس انداز ضرور کرنا چاہیئے۔ وہ کہا کرتا تھا "فلسفہ چھانٹنے سے پہلے آدمی کو زندہ رہنے کی حکمت سیکھنی چاہیئے!"

جان جاک روسو

"دنیا میں ہر شخص کا ایک کام ہوتا ہے۔ میرا کام یہی ہے۔ کہ میں تلخ مگر مفید سچائی عوام پر ظاہر کر دوں۔ جہاں تک میری استطاعت میں تھا، میں نے انسانیت، شرافت، اور رواداری کی دعوت دی ہے۔ اگر دنیا نے نہیں سنا، تو یہ میرا قصور نہیں ہے۔ میں نے اپنے لئے ایک قاعدہ بنا لیا ہے۔ میں عالمگیر سچائیوں کا ساتھ دونگا۔ میں کسی پہ الزام نہیں لگاتا، کسی کی تضحیک نہیں کرتا۔ کسی معیّن شخص پر حملہ نہیں کرتا میرا حملہ انسانوں پر ہے۔ میں کسی خاص فعل کو برا نہیں کہتا۔ میں شر کو برا کہتا ہوں۔"

ایک مرتبہ ایک مجلس میں انگریزی علم ادب کا غیر معمولی انسان اور انقلاب فرانس کا سب سے بہتر وقائع نگار، کارلائل موجود تھا۔ لوگ حکما کی خیالی نقشہ آرائیوں پر بحث کر رہے تھے۔ ایک شخص نے کہا "اجتماع و معاشرت کے انقلابات کے نقشے ایک دل خوش کن تخیل سے زیادہ نہیں ہیں۔" جونہی اس رائے زنی کی بھنک کارلائل کے کان میں پڑی، اس نے مجمع کو مخاطب کر کے کہا:-

حضرات کچھ عرصہ گذرا۔ اس دنیا میں ایک شخص تھا، روسو۔ اس نے ایک

کتاب لکھی تھی۔ جب یہ کتاب شائع ہوئی۔ تو بہت سے آدمیوں نے اس کی ہنسی اڑائی۔ لیکن جب اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تو اس کی جلد باندھنے کے لئے انہیں لوگوں کے جسم کا چمڑا استعمال کیا گیا تھا۔ جنہوں نے اس کی ہنسی اڑائی تھی!

یہ ہے یورپ کے اٹھارھویں صدی کی عجیب و غریب شخصیت جان جاک روسو۔ اور یہ ہے اس کی انقلاب انگیز اور عالم افگن تعلیمات کا ساحرانہ نفوذ، جس کی طرف کارلائل نے ان ضرب المثل بن جانے والے لفظوں میں اشارہ کیا تھا!

نپولین کہا کرتا تھا "انقلاب فرانس کچھ نہ تھا، مگر روسو" ایک اور موقعہ پر اس نے کہا "روسو ہی انقلاب کا باپ تھا" بلاشبہ روسو انقلاب فرانس کا باپ تھا۔ لیکن وہ اس سے بڑھ کر تھا۔ اس نے صرف فرانس ہی میں نہیں۔ بلکہ اپنے پورے عہد کی عقلی و اجتماعی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اس کے مبادیات (اصول) کو لوگ صحیح سمجھیں یا غلط۔ لیکن علمی دنیا کا فیصلہ یہی ہوا کہ وہ آنکھ بند کر کے اس کی رہنمائی پر چل پڑی، اور اس نے سوا دوسروں کی رہنمائی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اٹھارھویں صدی سے لے کر اس وقت تک دنیا کے قوموں کی حکومتوں میں ان کی سوسائٹی اور معاشرت میں، ان کے عقلی اعمال و عقاید میں، ان کے علم و فن کے کاروبار میں، ایک بہت بڑی زندہ حقیقت روسو اور روسو کے اصول و مبادی ہیں!

مختصر حالات زندگی

۱۷۱۲ء میں روسو جینوا میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ آیزک روسو ایک غریب آدمی تھا۔ مگر سست ناکارہ اور بد اخلاق۔ گھڑیوں کی مرمت کرتا۔ اور عورتوں کو ناچنا سکھا کر پیٹ پالتا

لیکن اس کی ماں بہت شریف عورت تھی۔ اُس کی شرم و حیا اور شریفانہ نسوانی جذبات کا تمام سوانح نگاروں نے اعتراف کیا ہے۔ روسو میں اپنے ماں اور باپ دونوں کے اخلاق جمع ہو گئے تھے۔ البتہ بعد میں اُس نے بہت کچھ اصلاح کر لی تھی۔

روسو کی ابتدائی تعلیم نہایت ناقص تھی۔ اُسے بچپن ہی سے افسانے اور خیالی قصّے پڑھنے کا شوق ہو گیا تھا۔ لیکن اُس کے تمام سوانح نگار تسلیم کرتے ہیں۔ کہ یہ مطالعہ اُس کے عجیب ذہن کے لئے مضر نہیں۔ بلکہ مفید ثابت ہوا۔

روسو ابھی پوری طرح جوان نہیں ہوا تھا۔ کہ اپنی روزی کمانے پر مجبور ہو گیا اُس کے والد نے اُسے دستکاری کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ مگر اُس میں کامیابی نہیں ہوئی کئی مقامات میں اُس نے نوکری کی۔ مگر اپنی تنگ مزاجی اور خاص قسم کی طبیعت کی وجہ سے کہیں جم نہ سکا۔ نہ وہ اپنے کسی آقا کو خوش کر سکتا تھا۔ نہ اُس کا کوئی آقا اُسے مطمئن کر دینے کی قابلیت رکھتا تھا!

اپنی زندگی کا یہ زمانہ اُس نے سخت مصائب میں گزارا۔ تنگ دستی ہمیشہ اُس کی رفیق رہی۔ بے اطمینانی نے کبھی ساتھ نہ چھوڑا۔ صحبت نہایت خراب تھی سوسائٹی کا سب سے زیادہ بدترین طبقہ اُس کے حصّے میں آیا تھا۔

ترقی و شہرت کا پہلا موقعہ

۳۹ سال اس طرح گزر گئے۔ اب تک وہ بالکل گم نام تھا۔ لیکن قدرت کی نظرِ عنایت اُس پر شروع ہی سے تھی۔ وہ اُسے اپنے مدرسۂ مصائب میں تیار کر رہی تھی۔ ۱۷۴۹ء میں اچانک اُس کے اقبال کا ستارا طلوع ہوا۔ فرانس کے ایک علمی مجمع (اکاڈیمی) نے ایک موضوع مقرر کیا۔ اور اہلِ علم کو اُس پر بحث کی دعوت

دی۔ مقابلہ سخت تھا۔ منتخب علما، میدان میں اتر پڑے تھے۔ تاہم روسو نے ہمت کی اور مضمون لکھا۔ اُس کا مضمون سب سے بہتر ثابت ہوا۔ مجمع علمی نے اس گمنام "عالم" کی قابلیت کا اعتراف کیا۔ اور اُسے مقابلہ کا انعام دے کر ہمت افزائی کی۔ اِس طرح دنیا نے پہلی مرتبہ سنا۔ کہ روسو، فرانس میں ایک بڑا عالم ہے!

حکومت اور کلیسا کا متحدہ فیصلہ

اب روسو پر شہرت کا دروازہ کھل گیا بڑی تیز گامی سے وہ آگے بڑھا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ کے اندر اپنے عہد کا سب سے بڑا عالم تسلیم کر لیا گیا۔

مگر کیا اس شہرت و عزت سے اُس کی زندگی کی مصائب دور ہو گئیں؟ نہیں اور زیادہ ہو گئیں۔ پہلے وہ صرف تنگ دستی کا شکار تھا، اب وہ حکومت اور کلیسا کی دشمنی کا بھی شکار ہو گیا۔ جوں ہی اُس کی تصانیف سوشل کنٹریکٹ، ہلوازہ، اور امیل نامی شائع ہوئیں۔ حکومت اور کلیسا کے ایوانوں میں تھلکہ مچ گیا۔ دونوں نے بیک وقت اُس پر یورش کر دی۔ اور انتقام لینے کے لئے اپنے تمام ہتھیار سنبھال لیئے!۔

مصائب و محن اور خاتمہ

امیل کے شائع ہوتے ہی، ۹ جون ۱۷۶۲ء میں حکومت فرانس نے روسو کی گرفتاری فرمان جاری کر دیا۔ مجبوراً اُسے فرار ہی میں سلامتی نظر آئی۔ فرانس سے بھاگ کر جینوا پہنچا۔ مگر یہاں کی حکومت بھی اُس کے لئے فرانس سے بہتر ثابت نہ ہوئی اُس نے بھی اس کی گرفتاری ضروری سمجھی۔ یہ حال دیکھ کر اُس نے ہالینڈ کا رُخ کیا مگر ہالینڈ بھی ایک ایسے شخص کے استقبال کے لئے تیار نہ تھا۔ اُس نے بھی

دار و رسن سے استقبال کرنا چاہا۔ اب اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ کہ اٹلی میں پناہ لے۔ وہ اٹلی پہنچا۔ مگر اٹلی پوپ کا پایۂ تخت تھا۔ وہ اس کے پہنچنے سے پہلے ہی اس کے کفر و انکار پر گرفتاری و قتل کا فتویٰ صادر کر چکا تھا۔ بے بس ہو کر وہاں سے بھی نکلا۔ اور انگلستان کے ایک گوشہ میں پناہ حاصل کر سکے گا۔ لیکن افسوس ہے۔ کہ وہ بھی بے رحم نکلا۔ اب اُس کی مصیبت کا جام چھلک گیا تھا۔

اب یورپ میں اُسے کہیں پناہ نہیں مل سکتی تھی۔ جہاں چھپتا تھا۔ وہیں دشمن کا ہاتھ دراز ہو جاتا تھا۔ ضاقت علیہم الارض بما رحبت و ضاقت علیہم انفسہم کے عالم میں مبتلا تھا۔ ابھی یہ مصیبت بڑھتی ہی جاتی تھی۔ کہ ایک دوسری مصیبت بھی شروع ہو گئی یعنی طرح طرح کے جسمانی امراض و آلام نے آگھیرا۔ آخر اسی حالت میں، کہ دُنیا اپنی ساری وسعت کے ساتھ اُس پر تنگ ہو چکی تھی، ۱۷۷۸ء میں انتقال کیا۔ اور گوشۂ قبر میں پناہ لی۔

ان مصائب نے روسو کے دل و دماغ پر کیا اثر ڈالا؟ کیا وہ اِن سے مرعوب ہو گیا تھا؟ کیا اپنے عقائد و افکار سے دست بردار ہو گیا تھا؟ کیا اُس نے اپنے بے پناہ دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال دئے تھے؟

اگر وہ ایسا کرتا۔ تو یقیناً عیش کی زندگی بسر کرتا۔ مگر صرف زندگی ہی بسر کرتا زندگی کی عظمت حاصل نہ کر سکتا۔ اپنی موت کے ساتھ ہی مر جاتا۔ اُس کی ساری عظمت، اس کی دماغی قابلیتوں سے زیادہ، اُس کے دل کی مضبوطی میں ہے۔ بلاشبہ وہ اپنا جسم کونے کونے میں چھپاتا پھرا۔ مگر اُس کا قلم بے پناہ شمشیر بلکہ ہمیشہ دشمن کا قلع قمع کرتا رہا۔ اُس کی بلیغ ترین کتابیں، اسی آخری عہدِ مصائب کی یادگار ہیں،

اُن میں سب سے بلند درجہ اُس کے "مکالمات" اور "اعترافات" کو حاصل ہے۔ اِن سے بھی بڑھ کر اُس کی وہ تحریریں ہیں، جو اُس نے پیرس کے اُسقف (لاٹ پادری) اور جینوا کی حکومت کے جواب میں لکھی تھیں۔

روسو اور کلیسا کا معرکہ

اس جنگ میں کون فتحمند رہا۔ روسو یا اُس کے دشمن؟

اس کا جواب مدت ہوئی خود زمانہ دے چکا ہے! زندگی میں اُس کے لئے دُنیا چار بالشت زمین کا گوشہ بھی مہیا نہ کر سکی، لیکن اس کے مرنے کے بعد یورپ کا تمام برِّ اعظم اپنے ذہن و فکر کا صرف ایک ہی حکمران رکھتا تھا، اور وہ یہی معتوبِ عالم "روسو" تھا!

لیکن آج ہمیں روسو کی زندگی پر تبصرہ کرنا نہیں ہے۔ روسو کی زندگی پر تبصرہ رسائل کے مقالات میں نہیں، ضخیم کتابوں میں ہو سکتا ہے۔ آج ہم صرف اس کی فکری اور قلمی معرکہ آرائیوں میں سے ایک خاص معرکہ دکھانا چاہتے ہیں۔ یہی اس کے قلم کے معرکے ہیں۔ جو تھوڑے سے عرصے کے اندر انقلاب فرانس کے خونیں معرکوں کی شکل میں مُتبدل ہو گئے۔ یہ معرکہ اُس میں اور پیرس کے اُسقف کے درمیان واقع ہوا تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے۔ علم و عقل کے نئے ظہور اور مسیحی کلیسا کے قدیم جہل و جمود میں ہوا تھا۔ ہم اختصار پر مجبور ہیں۔

اُسقف کا بیان

اسقف نے اپنا بیان اس افسوس کے ساتھ شروع کیا ہے۔ کہ فرانس میں کفر اور الحاد پھیلتا جاتا ہے پھر یہ ثابت کیا ہے۔ کہ یہ صورتِ حال، قربِ قیامت کی علامت ہے۔ جیسا کہ

پولس رسول نے پیشین گوئی کی ہے۔ پھر اس مقدس مگر ہولناک تمہید کے بعد وہ روسو پر پے در پے حملے شروع کر دیتا ہے:۔

"یہی وہ الحاد ہے۔ جسے ایک شخص (یعنی روسو) نے اپنی کتاب "ایمیل" Emilius میں پیش کیا ہے۔ اس شخص نے گناہ میں نشوو نما پائی ہے۔ یہ ایک ایسی زبان بولتا ہے جو فلاسفہ کی زبان ہے۔ مگر وہ خود فلسفہ سے تہی دست ہے۔ یہ ایک ایسا ذہن ہے جس میں معلومات بے ترتیبی سے ٹھونس دیئے گئے ہیں۔ مگر وہ ہنوز تاریک ہے اور صرف اپنی تاریکی ہی پر قانع نہیں ہے۔ بلکہ دوسرے دلوں میں بھی تاریکی اتار رہا ہے یہ ایک ایسی طبیعت ہے جو عجیب و غریب افکار کی دلدادہ اور مجہول راستوں کی شیفتہ ہے۔ اس میں اخلاق کا افلاس اور فکر کی ثروت، دونوں بیک وقت جمع ہو گئی ہیں۔ ایک طرف اُسے متقدمین کے اُصول سے شغف ہے۔ دوسری طرف عقلی بدعتوں کی ایجاد کا جنون ہے۔ وہ خلوت پسند بھی ہے۔ اور شہرت پسند بھی۔ علم کی محبت کا بھی دعویٰ رکھتا ہے۔ اور علم کی عداوت کا بھی علم اُٹھاتے ہے۔ انجیل کے کمال کا بھی اعتراف کرتا ہے۔ اور اُسے جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی بھی کوشش کرتا ہے۔ فضیلت کی ایسی خوبصورت تصویریں اتارتا ہے۔ کہ بے اختیار تحسین و آفرین کا نعرہ بلند ہو جاتا ہے۔ مگر پھر فوراً ہی فسق و فجور کے پھاوڑوں سے اپنی بنائی ہوئی شاندار عمارت گرا بھی دیتا ہے۔ یہ نوع انسانی کا معلم بن کر سامنے آیا ہے، مگر الحاد اور گمراہی کے سوا کچھ نہیں رکھتا۔ یہ ضلالت کا امام ہے۔ فساد کا مرشد ہے۔ شیطان کا پیامبر ہے تاریکی کا رہبر ہے۔ اور اس سے بھی کچھ زیادہ ہے۔ وہ اپنی کتاب میں انسان کو حیوان کے درجہ میں رکھتا ہے۔ ایک اور رسالہ میں نفس پرستی کی تبلیغ کرتا ہے۔ پھر تربیت

کی کتاب لکھتا ہے۔ مگر سراسر الحاد کی دعوت دیتا ہے!"

آگے چل کر اُسقف نے روسو کی کتاب "تربیت" پر اعتراض کئے ہیں۔ اور اس پر زور دیا ہے۔ کہ یہ "دعوت الحاد" کی دعوت دی گئی ہے۔ وہ صرف یہ ہے، کہ وہ کہتا ہے۔ بچّہ کی دماغی تربیت و تعلیم ایسی ہونی چاہیئے کہ وہ خود اس قابل ہو جائے کہ دینِ حق کی معرفت پیدا کر سکے، اور اسے تقلید و رسوم کی بنا پر نہیں۔ بلکہ فہم و بصیرت کے ساتھ منتخب کرے۔ ہمیں اس بات سے احتراز کرنا چاہیئے۔ کہ اُسے کوئی ایسی دماغی جکڑ بندی کی تعلیم دیں۔ جس سے اُس میں دماغی بصیرت اور مجتہدانہ فکر کی قوت پیدا نہ ہو سکے۔ اور دل و دماغ کسی جابرانہ تاثیر سے منفعل ہو جائیں۔ ہمیں اس سے بھی احتراز کرنا چاہیئے۔ کہ اس کے دماغ میں کوئی ایسی بات اتار دیں، جسے وہ خود اپنی عقل سے معلوم نہیں کر سکتا"

اس پر اسقف نے اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے:- "ہمیں اس نظریہ پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لیکن سوال یہ ہے۔ کہ کیا بچّہ کو گمراہ ہو جانے کے لئے چھوڑ دینا چاہیئے؟ اگر ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ تو وہ سچا طریقہ کیا ہے؟ کتاب تربیت کا مولف بند بند لفظوں میں الحاد کی طرف دعوت دیتا ہے۔ لیکن ہم فطرت کے سچے طریقے یعنی مسیحیت کو پیش کرتے ہیں۔ درحقیقت دینِ مسیحی فطرتی دین ہے۔ فطرت ہمیشہ اسی کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ عقلِ انسانی بجز انجیل کے راستہ کے کوئی دوسری راہ قبول ہی نہیں کر سکتی۔ یہ اس لئے کہ انجیل کا دین، فطرت اور عقل کا دین ہے!"

روسو اُسقف کی تمام تشریحات برداشت کر سکتا تھا۔ لیکن یقیناً اس بات کی برداشت اس کی طاقت سے باہر ہوئی۔ کہ مسیحیت فطرت کی سچائی ہے"

اور وہ فطرت اور عقل کے دین کی طرف رہنمائی کرتی ہے" یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ پُرجوش اُسقف اور اس کے تمام ہم مشرب جس "مسیحیت اور انجیل" پر عامل تھے اور اس کی دعوت دے رہے تھے، وہ "کلیسا" اور "پوپ" کی "مسیحیت" تھی۔ نہ کہ مسیحیت کی پہلے عہد کی سادہ اور بے میل مسیحیت۔ امریکن مصنف ڈریپر کے لفظوں میں "اٹھارھویں صدی کے تمام اجتماعی انقلابات غیر ضروری ہو جاتے، اگر کلیسا اور پوپ کی نمایندگی کی جگہ مسیحیت اور مذہب کی کوئی دوسری نمایندگی وجود میں آ سکتی۔۔"

دراصل ازمنۂ وسطیٰ کی مسیحیت کا جو جہل پرور اور مستبد مزاج پیدا ہو گیا تھا اس کا قدرتی ردِ فعل والٹیر اور روسو کا انکار اور کفر تھا!"

اس کے بعد اُسقف کہتا ہے "اگر دینِ مسیحی ہی وہ سچا طریقہ ہے جس کے سوا فطرتِ انسانی کوئی دوسری راہ تصوّر ہی نہیں کر سکتی۔ تو پھر روسو کا دینی تعلیم و تربیت پر نکتہ چینی کرنا بجز اس کے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کہ ہدایت سے ہٹا کر ضلالت کی طرف بلا رہا ہے!"

روسو نے کہا تھا "ہر بچہ جو اپنے بچپنے میں خدا پر ایمان رکھتا ہے۔ ایک طرح کا بت پرست ہے۔ اور خدا کو انسان کی صورت میں یقین کرتا ہے۔ عقلِ انسانی اس عمر میں، خدا کا منزہ اور مطلق تصور کر ہی نہیں سکتی!"

اُسقف کا اس پر اعتراض یہ ہے "اگر بچہ بت پرست ہوتا۔ تو کئی خداؤں کا قائل ہوتا اگر اس کے تفکر میں تجسم ہوتا۔ (یعنی خدا کو انسان کی صورت دیتا) تو پڑنگا کا مجسم ہوتا۔ حالانکہ مسیحی بچوں کا کبھی ایسا اعتقاد نہیں ہوتا۔ وہ صحیح معنوں میں موحد ہوتے ہیں۔ مولف (روسو) نے یہ کہہ کر دراصل مسیحیت کو بت پرستی قرار دیا

ہے!"

روسو نے لکھا تھا "میں جانتا ہوں کہ نظام عالم کو ایک قادر و حکیم ارادہ چلا رہا ہے۔ میں یہ دیکھتا یا محسوس کرتا ہوں، اور اس کی معرفت میری زندگی کے لئے ضروری ہے۔ لیکن یہ عالم کب سے اور کس طرح ہے؟ اشیاء کی اصل ایک ہے۔ یا متعدد ہیں؟ ان کی طبیعت کیا ہے؟ یہ میں نہیں جانتا، اور نہ مجھے جاننے کی ضرورت ہے . . . . یہی باعث ہے کہ میں یہ حقیر مسائل نظر انداز کر جاتا ہوں۔ ممکن ہے یہ میری عقل کو مشغول کر لیں۔ مگر یہ مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ پھر یہ مسائل میری عقل سے بالاتر بھی ہیں . . . . ."

اس پر اسقفت اعتراض کرتا ہے "بے باک مصنف کا اس قول سے کیا مقصد ہے؟ وہ جانتا ہے کہ کائنات کا نظام ایک قادر و حکیم ارادہ کے ماتحت ہے۔ وہ اعتراف کرتا ہے کہ اس حقیقت کا علم اس کے لئے ضروری ہے لیکن باوجود اس کے کہتا ہے، نہیں معلوم اشیاء کی اصل ایک ہے۔ یا ایک سے زیادہ ہے؟ پھر دعویٰ کرتا ہے کہ مجھے اس نقطہ کے معلوم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مصنف، در اصل خدا کی وحدانیت پر شک رکھتا ہے۔ اس علم کے بعد کہ کائنات ایک قادر و حکیم ارادہ کے تصرف و اختیار میں ہے، کیا یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اشیاء کی اصل ایک ہے یا کئی ہیں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ پہلی حقیقت کا علم ضروری ہو۔ اور دوسری کی معرفت غیر ضروری قرار پائے؟ کیا یہ صریح تناقض اور الحاد نہیں ہے؟ وہ کہتا ہے۔ میں خدا کی طبیعت، حقیقت سے باخبر ہوں، لیکن ساتھ ہی یہ دعویٰ بھی کرتا ہے کہ یہ موجود حقیقی، علم، قدرت، ارادہ، اور حکومت رکھتا ہے! اس سے تو معلوم ہوا۔

کہ وحدانیت اُس کے خیال میں ایک "حقیر سا مسئلہ" ہے ، اور کسی طرح بھی اس کی عقل میں نہیں آسکتا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے ، متعدد خداؤں کا تصور اُس کی عقل کے نزدیک معقول ہے - بھلا اِس حماقت سے بڑھ کر بھی کوئی حماقت ہو سکتی ہے ؟ "

روسو ، معجزات کو اس معنی میں تسلیم نہیں کرتا کہ وہ خارق عادت ہیں معجزات پر گفتگو کرتے ہوئے اُس نے لکھا ہے - یا للعجب! ہمیشہ آدمیوں ہی کی گواہیاں! آدمی ، اپنے ہی جیسے آدمیوں سے سنتے ہیں اور دوسرے آدمیوں کو سناتے ہیں! میرے اور خدا کے درمیان آدمیوں کے کتنے ان گنت واسطے قائم ہو گئے ہیں! "

اِس پر اسقف لکھتا ہے " اگر آدمیوں کی گواہی معتبر نہیں ہے - تو پھر ہم پوچھتے ہیں - مؤلف نے اسپارٹا ، ایتھنز ، اور روم کو کیونکر جانا - جن کی عظمت کا وہ ہمیشہ راگ گایا کرتا ہے ؟ اِن قدیم جمہوریتوں اور مولف کے مابین آدمیوں کے کتنے بہت سے واسطے موجود ہیں ؟ - وہ اِن واسطوں پر شک نہیں کرتا - لیکن مسیحی معجزات کی روایت میں وہ کوئی واسطہ منظور کرنا نہیں چاہتا - دراصل اس کے اعتراض کی اصلی علت " الحاد ہے - وہ خدا ہی کو نہیں مانتا ! "

اسقف کا بیان بہت طویل ہے - اِس مضمون میں اس کا پورا خلاصہ بھی ممکن نہیں - لیکن اُس کا آخری اعتراض ضرور نقل کر دینا چاہیئے - روسو نے بادشاہوں کے وجود پر سختی سے حملہ کیا ہے - اسقف اس کے جواب میں لکھتا ہے : -

یہ بھی مولف کا الحاد ہی ہے - جس سے متاثر ہو کر وہ بادشاہوں کے

وجود پر نکتہ چینی کرتا ہے۔ بادشاہوں کو برباد کرکے وہ ایسے قواعد جاری کرنا چاہتا ہے جن کا نتیجہ بجز بدامنی اور طوائف الملکی کے اور کچھ نہیں ہوگا۔ مصنف کے مذہب اور دینِ حق میں کتنا تضاد ہے؟ مصنف بداخلاقی اور بدامنی کی تعلیم دیتا ہے۔ لیکن دینِ حق خشیتِ الٰہی اور بادشاہ کی اطاعت کا حکم دیتا ہے۔ دین کا حکم یہ ہے۔ کہ ہر آدمی اپنے آقا کی فرمانبرداری کرے۔ دین کہتا ہے بادشاہی خدا کی قوت ہے۔ اس کا پاک سایہ ہے۔ اور اسی نے زمین پر نازل کی ہے۔ جو اس کا مخالف ہے۔ وہ خود خدا کا باغی ہے۔ اس پر خدا کی ابدی لعنت ہو!۔

اس طرح اسقف نے اپنا رسالہ قربِ قیامت کی ہولناکی سے شروع کر کے "ابدی لعنت" کی پیشکش پر ختم کر دیا ہے!۔

یہ روسو کے سب سے بڑے کلیسائی مناظر کا حملہ تھا۔ اب دیکھنا چاہیئے روسو نے اس کا دفاع کیونکر کیا ہے؟ روسو کے سخت سے سخت نکتہ چیں بھی تسلیم کرتے ہیں۔ کہ اس کا جواب مناظرانہ قوت بیانیہ کا بے نظیر ثبوت تھا۔

اسقف کا جواب

روسو نے اپنا جواب معذرت سے شروع کیا ہے:۔

معذرت

اگر آپ صرف میری کتاب ہی پر اعتراض کرتے تو میں ہرگز آپ سے کوئی تعرض نہ کرتا۔ آپ کو چھوڑ دیتا کہ جتنی چاہیں نکتہ چینی کرتے رہیں لیکن آپ نے صرف کتاب ہی پر نہیں، بلکہ میری ذات پر بھی بحث کی ہے۔ آپ کو دنیا دنیا میں جتنی عزت اور قوت حاصل ہے، اسی مناسبت سے آپ میں یہ بات

بھی ہوتی تھی۔ کہ اُن تہمتوں سے بلند تر ہوتے۔ جن سے آپ نے مجھے آلودہ کرنا چاہا ہے۔"

داستانِ مظلومی اس کے بعد روسو نہایت بلاغت و مہارت سے اپنے قارئین کی ہمدردی حاصل کرنی چاہتا ہے۔ وہ اپنی مسکینی و مظلومی ظاہر کرتا ہے، تمام یورپ کا اُس کے خلاف متحد ہو جانا اور عرصۂ زمین تنگ کر دینا یاد دلاتا ہے۔ پھر لکھتا ہے:۔

"جینوا کے غلام، روسو کے ہاتھ میں کوئی قوت نہیں کہ اُن ظالم اور سرکش ججوں سے جواب طلب کر سکے۔ جن کے سامنے اُس پر تہمت لگائی گئی۔ اور جنہوں نے اُسے طلب کئے بغیر اُس کے خلاف فیصلہ صادر کر دیا ہے۔ اتنا ہی نہیں۔ بلکہ اُسے قید کرنے کے بھی درپے ہو گئے ہیں۔ یہ غلام اگر عدالت میں طلب کیا جاتا۔ تو اپنی برأت ظاہر کرنے ضرور حاضر ہوتا، مگر چونکہ اُسے بلایا نہیں گیا، اس لئے اسے از خود حاضر ہونے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ چنانچہ وہ حاضر نہیں ہوا۔ اس پر اُس کے خلاف جنگی قوت جمع کی گئی۔ اُس نے قوت کے مقابلہ سے گریز کیا۔ اور اس سرزمین سے بھاگ نکلا جہاں کمزوروں پر ظلم کیا جاتا ہے، بغیر جرم کے سزا دے دی جاتی ہے۔ اور بغیر جواب سنے بیڑیاں پہنا دی جاتی ہیں

اُس نے مجبوراً اپنا محبوب خلوت خانہ چھوڑا۔ اُن دوستوں کی جدائی سہی۔ جن سے بڑھ کر اُس کے لئے کوئی عیش نہ تھا۔ اپنا ناتواں جسم لے کر ہزاروں امیدوں کے ساتھ سرزمینِ حریت میں پہنچا۔ آہ، میرا وطن جینوا! میں نے تیری آزادی کے کیسے کیسے گیت گائے؟ تیرے حسن و جمال کی کیسی کیسی تصویریں بنائیں؟ دنیا میں تیرا نام کس

پادریوں کا چنگل "مرمرکے اس نے جلادوں کے پنجہ سے رہائی حاصل کی تھی۔ مگر وائے بدنصیبی، فوراً قسیسوں کے چنگل نے اسے آدبوچا! میں یہ اس لئے نہیں کہتا۔ کہ مجھے اس پہ کوئی تعجب ہے۔ لیکن بلاشبہ یہ عجیب ہے۔ کہ ایسا شریف و نجیب انسان اور پیرس کا اُسقفِ اعظم جو صرف شریف النسب ہی نہیں۔ بلکہ شریف النفس بھی ہے، کیونکہ اپنی جماعت کی بزدلی میں شریک ہوگیا۔ حالانکہ اُسے ایسی دناءت سے بلند ہونا چاہیئے تھا۔ ایک مذہبی پیشوا ہونے کی حیثیت سے اُس کا فرض تھا۔ کہ مظلوم پر ترس کھائے۔ نہ یہ کہ اُلٹا مظلوم کے کچلنے پر کمربستہ ہوجائے۔ وہ مظلوم جو پہلے ہی سے زمانہ کے ہاتھوں کچلا جاچکا ہے"

اس اُسقفِ اعظم کے تمام حاشیہ بردار۔ اِس ناکردہ گناہ کے مٹا ڈالنے پہ تل گئے ہیں۔ وہ یقین کرتے ہیں۔ کہ ہم اُسے ضرور بالضرور مٹا دیں گے۔ حقیر سے حقیر واعظ اور ادنیٰ سے ادنیٰ مجاہد بھی کوشش کر رہا ہے۔ کہ اس خود ساختہ دشمن کے گلا گھونٹنے کا فخر صرف اُسی کو حاصل ہو۔ اور اِس کے سر پر فیصلہ کن ضرب اُسی کے پاؤں کی ٹھوکر سے لگے!"

اُسقف نے کیوں فتویٰ شائع کیا؟ اے میرے سردار! کون شک کرسکتا ہے۔ کہ اگر پیرس کی مجلس حکومت نے میرے خلاف حکم صادر نہ کیا ہوتا۔ تو آپ کو میری کتاب سے بغض کم ہوتا۔ بلاشبہ بعض لوگ یہی خیال ظاہر کرتے ہیں۔ مگر آپ کا حق پسند دل اسے ہرگز تسلیم نہیں کرسکتا۔ کیونکہ یہ خلاف واقعہ ہے۔ اے میرے آقا!

مجھے بتائیے، آپ نے اب سے پہلے میرا رد کرنے کی زحمت کیوں گوارا نہیں کی؟
میں نے آپ کے منصب کے خلاف رسالہ شائع کیا۔ میں نے دی لامبرٹ
کے نام خطوط چھاپے، کئی کتابیں لکھیں مگر آپ کے قلم کو کبھی جنبش نہ ہوئی! حالانکہ
میری ان کتابوں میں بالکل ویسے ہی خیالات موجود تھے۔ جیسے کتاب التربیت
میں ظاہر کئے گئے ہیں۔ کیا آپ نے میری یہ کتابیں نہیں پڑھی تھیں؟ حالانکہ اگر
نہ پڑھی ہوتیں تو اپنے اس رد میں ان پر بحث نہ کر سکتے۔ کیا آپ کی یہ خاموشی آپ
کے دینی فرائض کے خلاف نہ تھی؟ حالانکہ بقول آپ کے ان کتابوں میں بھی الحاد
کی دعوت دی گئی ہے۔ کیا یہ حقیر مؤلف اس وقت کم خطاکار تھا اور اب زیادہ
ہو گیا ہے؟ حالانکہ آپ اُسے پیدائشی خطاکار قرار دیتے ہیں۔ آخر کیا بات تھی جو
اتنی مدت تک زبان مبارک نہ ہلی؟ یہ وجہ تو نہ تھی۔ کہ اس وقت آپ کے دشمن کم
تھے۔ اور میں بھی خائنوں سے گھرا ہوا نہ تھا؟ اس وقت عوام میں میری کتابیں
مقبول ہو چکی تھیں۔ اور آپ عوام کے غصے سے ڈرتے تھے؟ لیکن اب، جبکہ حالات
میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ میرے دشمنوں نے ایکا کر کے مجھ پر یورش کر دی۔ مجھے ملحد
اور باغی مشہور کیا۔ حکومت نے بھی ہتھیار سنبھال لئے۔ اور آپ کے دشمنوں نے
بھی کہنا شروع کر دیا۔ کہ پیشوائے اعظم ہو کر آپ اس ملحد کے خلاف کچھ نہیں کہتے
گویا اپنی خاموشی سے اس کی حمایت کر رہے ہیں تو آپ اپنے منصب کی حفاظت
کے خیال سے اٹھے۔ اور اپنے دشمنوں کا منہ بند کرنے کے لئے میرے خلاف
برانگیختہ کیا؟ اگر ایسا ہی ہے تو بلاشبہ میرے دماغ کو شدت تحیر سے سکتہ
ہو جانا چاہیئے!"

اِس تمہید کے بعد روسو، اُسقف کے بیان کا رد شروع کرتا ہے۔

اُسقف نے لکھا تھا:-

صفاتِ الٰہی

"روسو کہتا ہے۔ مَیں خدا کی حقیقت سے بے خبر ہوں، لیکن ساتھ ہی یہ دعویٰ بھی کرتا ہے۔ کہ یہ موجود حقیقی علم، قدرت، ارادہ اور حکمت رکھتا ہے!"

روسو جواب دیتا ہے: "خدا کی صفت، علم ہے۔ لیکن اس کا علم اقدس کسی تفکر و تامّل کا محتاج نہیں، اُس کی تفکیر کے لئے نہ تو مقدمات ہیں، نہ نتائج ہیں۔ نہ ذہن و قیاسات ہیں۔ اس کا علم ازلی ہے۔ جو تھا، جو ہے، جو ہوگا۔ سب اُس پر آشکارہ ہے۔ تمام حقائق اس کے سامنے ذرۂ ریگ سے بھی چھوٹے ہیں۔ تمام دُنیا اس کی نظر میں قطرۂ آب سے بھی محدود ہے۔ تمام اگلے پچھلے زمانے اُس کے نزدیک لمحہ بھر سے بھی مختصر ہیں"

"باقی رہی قدرتِ الٰہی، تو قدرتِ الٰہی کا یہ حال ہے۔ کہ انسان کو اپنی قوتِ عمل کے لئے وسائلِ عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن خدا کو کسی وسیلے کی ضرورت نہیں۔ قوتِ الٰہی خود اپنی قوت سے عمل کرتی ہے۔ خدا قادر ہے! کیونکہ وہ ارادہ رکھتا ہے اور اُس کا ارادہ ہی اُس کی قدرت ہے"

"خدا، لاریب خیر ہے۔ انسان کا خیر یہ ہے کہ اپنے بنی نوع سے محبت کرے لیکن خدا کا خیر اُس کا وہ نظام ہے۔ جس سے وہ کائنات کو سنبھالے اور تمام اجزا کو باہم جوڑے ہوتے ہے۔"

"خدا لاریب عادل ہے۔ عدلِ الٰہی بھی اس کے خیر ہی کا ایک نتیجہ ہے۔ انسان

کا ظلم، خود انسان کا اپنا عمل ہے، خدا کا عمل نہیں ہے۔ روح کا اضطراب، جس کی وجہ سے فلاسفۂ قدرتِ الٰہی کے منکر ہو جاتے ہیں۔ میری نظر میں اس لا متناہی قدرت کو اور زیادہ واضح کرنے والا ہے، انسان کا عدل یہ ہے۔ کہ ہر حقدار کو اُس کا حق دے دے۔ خدا کا عدل یہ ہے۔ کہ ہر ایک سے اپنی نعمتوں اور بخششوں کا حساب لے!"

حقیقتِ الٰہی

یہ صفات مَیں نے عقل کی منطق کی راہ سے معلوم کر لی ہیں۔ لیکن میرے دماغ میں اُنکا مفہوم مرتب و مفصّل نہیں ہے۔ مَیں انہیں تسلیم کرتا۔ اور ان پر اصرار کرتا ہوں، مگر اُن کی پوری حقیقت کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ عقل اس کا احاطہ کر ہی نہیں سکتی۔ اِس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہوتے۔ کہ مَیں حقیقت سے لا علم ہوں۔ اور اس لئے میری حیثیت یہ نہیں ہے۔ کہ مَیں جانتا ہوں اور اصرار کرتا ہوں۔ مَیں اپنے دل سے بے فائدہ کہتا ہوں "یہی خدا ہے"۔ مَیں بے فائدہ اس کا شعور کرنا چاہتا ہوں۔ مَیں بے فائدہ اپنے ذہن میں اُس کا تصوّر کرتا ہوں "بے فائدہ"۔ اس لئے کہ اس سے خدا کی حقیقت پر ذرا بھی روشنی نہیں پڑتی۔ مَیں ہرگز معلوم نہیں کر سکتا، خدا ایسا کیوں ہے؟ اُس میں یہ صفات کیونکر قائم و موجود ہیں؟

مَیں اُس کی حقیقت جاننے کی جتنی زیادہ کوشش کرتا ہوں، اتنی ہی اُس کی حقیقت پوشیدہ ہوتی جاتی ہے۔ میری یہ عقل کی بے بسی مجھ میں اس کا اعتقاد و ایمان اور بھی زیادہ مستحکم کر دیتی ہے۔ مَیں جس قدر اس کا تصوّر کم کر سکتا ہوں، اسی قدر اُس سے زیادہ وابستہ ہوتا۔ اور اُتنا ہی اُس کی عبادت پر جھکتا جاتا ہوں۔ تو اُتنا ہی زیادہ میرا نفس بلند کرتا جاتا ہے، مگر تیری حقیقت برابر مجھ سے مستور رہی رہتی ہے!

کا شاگرد ہوں۔ میرا استاد، کتابوں کی عبارتوں پر بحث نہیں کرتا تھا، لیکن عمل پر نظر رکھتا اور عمل ہی پر زور دیتا تھا۔ اُس نے ہمیں جس ایمان کی تلقین کی ہے اُس کے قواعد و اصول بہت زیادہ اور پیچ در پیچ نہیں ہیں۔ صرف گنتی کی چند موٹی موٹی باتیں ہیں۔ لیکن اُس نے جس نیکی کی تعلیم دی ہے، اُس کی شاخیں بے شمار اور اس کی راہیں بے حساب ہیں۔ اس نے ہمارے ایمان میں موشگافیاں نہیں کی ہیں۔ لیکن عمل صالح کی پورے شرح و بسط سے تفسیر کی ہے۔ اس نے ایمان کے لئے صرف دو تین موٹی موٹی باتیں ضروری ٹھہرائی ہیں۔ لیکن عمل کی نیکی کے لئے کوئی گنتی نہیں بتائی ہے، کیونکہ عملی نیکیاں اَن گنت ہیں۔ اُس نے جہاں کہیں انبیاء کے نمونوں پر زور دیا ہے۔ وہاں ایمان سے زیادہ اُن کے اعمال بتاتے ہیں۔ اُس نے اپنی اور تمام نبیوں کی تعلیم کا لب لباب اِس ایک جملہ میں بیان کر دیا۔ "اپنے بھائی سے محبت کرنا، پورا دین ہے!"

دوستوں اور دشمنوں کو دعوت

اِس کے بعد لکھتا ہے:۔

مجھے ہمیشہ خلوت کی پُرمسرت زندگی حاصل نہیں رہی۔ لوگوں سے ملنے جلنے پر بھی مجبور ہوتا رہا ہوں۔ میری ہر طبقہ کے لوگوں سے ملاقات ہے۔ میں نے مختلف سیاسی اور دینی جماعتوں کے لوگ دیکھے ہیں۔ مَیں مومنوں سے بھی ملا ہوں اور ملحدوں سے بھی۔ مَیں نے حکما بھی دیکھے ہیں، جہلا بھی، متعصب بھی دیکھے ہیں، غیر متعصب بھی۔ سنجیدہ بھی میری صحبت میں بیٹھے ہیں، اور مسخرے بھی، میرے دوست بھی بہت ہیں۔ اور دشمن بھی۔ مَیں دُنیا میں تمام آدمیوں کو، جنہوں نے مجھے کبھی دیکھا یا

جاتا ہے، گلا پھاڑ پھاڑ کر پکارتا اور دعوت دیتا ہوں۔ وہ سامنے آئیں۔ اور میرے عقیدے کی بابت جو کچھ جانتے ہوں، برملا کہہ ڈالیں! وہ جرأت سے بڑھیں، اور بتائیں، کبھی، کسی حال میں بھی انہوں نے میرے عقیدے میں کوئی تبدیلی دیکھی یا محسوس کی؟ قہوہ خانے کی صحبتوں، کھانے کی میز کی نشستوں، بے تکلفی کی ملاقاتوں سنجیدہ یا مذاح کی گفتگوؤں، غرضیکہ کبھی کسی موقعہ پہ بھی انہوں نے میری زبان سے کوئی ایسا لفظ سنا۔ جو اُس سے مختلف تھا۔ جس کا مَیں اپنی کتابوں میں اعلان و اشتہار کرتا رہا ہوں؟ وہ صاف صاف کہیں، ان کی دلیلیں، ان کی نکتہ چینیاں، اُن کا تمسخر، کبھی میرے عقیدے میں کوئی تزلزل پیدا کر سکا ہے؟ وہ بتائیں، کبھی ایک لمحہ کے لئے، انہوں نے محسوس کیا۔ کہ مَیں کوئی ایسا عقیدہ یا خیال رکھتا ہوں۔ جو علی الاعلان دنیا کے سامنے ظاہر نہیں کرتا؟ ہاں، مَیں اپنے تمام دوستوں اور تمام دشمنوں کو ایک ساتھ دعوت دیتا ہوں۔ دوستوں کو دوستی کا واسطہ دیتا ہوں۔ دشمنوں کو دشمنی کی قسم دیتا ہوں۔ بے رو و رعایت، بے خوف و خطر، مردانہ وار میدان میں آئیں، اور جو کچھ بھی میری نسبت کہہ سکتے ہوں، بے کھٹکے کہہ ڈالیں! مَیں اپنے دوستوں اور دشمنوں، دونوں کی شرافت و دیانت پر بغیر کسی پس و پیش کے بھروسہ کرتا ہوں۔ مَیں اپنی پوری شرافت اُن کے سامنے رکھے دیتا ہوں۔ مَیں ہرگز کسی سے بحث اور حجت نہیں کرونگا۔ جو کچھ بھی وہ کہہ دینگے۔ بے چون و چرا تسلیم کرلونگا!"

انبیاءِ کرام کی عظمت

مَیں اُن تمام انسانوں کی عزت کرتا ہوں، جنہوں نے مذاہب و ادیان قائم کئے

ہیں، وہ سب عظیم کمال اور اعلیٰ فضائل کے مالک تھے۔ ان کی عظمت و فضیلت ہمیشہ محترم و مسلم رہے گی۔ سب کا دعویٰ تھا کہ خدا کے پیغام بر ہیں۔ ممکن ہے وہ حقیقت میں پیغمبر ہوں یا نہ ہوں سب کے دعوے تسلیم نہیں کر لے سکتے۔ دلائل یکساں طور پر سب کی سند میں نہیں ہیں۔ لیکن اگر وہ فی الواقع پیغمبر نہ بھی ہوں، جب بھی اس سے یہ لازم نہیں آتا۔ کہ وہ کذاب اور دجال ہوں کون کہہ سکتا ہے۔ کہ الہیات میں مسلسل تفکر اور فضائل کا غیر مفید عشق انسانی روح کو کسی حد تک پہنچا دے سکتا ہے، منطق کو کیب حق ہے۔ کہ مداخلت کر کے یہ معاملہ عامیانہ سطح پر لے آئے، غیر متناہی بلندی پر پہنچانے کے بعد ہمارا سر جھکا جاتا ہے اور ہماری نظریں اشیاء کو ان کی حقیقی شکل میں دیکھنے سے قاصر ہو جاتی ہیں۔"

معجزات

معجزات پر روسو نے لکھا تھا۔ "یا العجب! ہمیشہ آدمیوں ہی کی گواہیاں! آدمی، اپنے ہی جیسے آدمیوں سے سنتے ہیں۔ اور دوسرے آدمیوں کو سناتے ہیں! میرے اور خدا کے درمیان آدمیوں کے کتنے ان گنت واسطے قائم ہو گئے ہیں؟"

اس پر اسقف نے اعتراض کیا تھا۔ "اگر آدمیوں کی گواہی معتبر نہیں تو ہم پوچھتے ہیں۔ مؤلف نے اسپارٹا، ایتھنز، اور روم کو کیونکر جانا . . . ؟"

روسو جواب دیتا ہے

"اگر معاملہ اس درجہ اہم نہ ہوتا۔ یا میں اے آقا، آپ کا اس درجہ احترام نہ کرتا ہوتا۔ تو آپ دیکھتے، آپ کے اس طریق استدلال نے میرے لئے اپنے

اپنے ناظرین کو منشا نیے کی کیسی عمدہ فرصت مہیا کر دی تھی۔ لیکن حاشا و کلا! میں ہرگز اس وجہ سے دست بردار نہیں ہونگا۔ جو اس موضوع بحث کے لئے ضروری ہے، اور اس شخص کے مرتبہ کے لائق ہے۔ جس سے تخاطب کی عزت حاصل کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ میرے لئے اس قدر کافی ہے۔ کہ آپ کی غلطی ظاہر کر دوں؟

میں نہایت عاجزی سے جنابِ والا کو یاد دلاتا ہوں، بے شک یہ بالکل معقول ہے۔ کہ انسانی معاملات انسانی شہادتوں سے طے کئے جائیں۔ کیونکہ اُن کے ثابت ہونے کا اس کے سوا کوئی طریقہ موجود نہیں۔ بلاشبہ میں نے اسپارٹا اور ایتھنز کو آدمیوں ہی کی شہادتوں سے جانا۔ لیکن میں بہ ادب دریافت کرتا ہوں کہ میرے اور خدا کے درمیان ان واسطوں کی کیا ضرورت ہے؟ کیا ضرور ہے۔ کہ یہ واسطے مجھ سے اتنے دور ہوں۔ کہ خود اُن کے جاننے کے لئے، مجھے اور بہت سے انسانی واسطے تلاش کرنے پڑیں؟ یا یہ معقول ہے۔ کہ خدا جان جاک روسو سے گفتگو کرنے کے لئے ہمیشہ ایک موسیٰ (علیہ السلام) کو ڈھونڈھتا پھرے؟"

پھر یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے۔ کہ اسپارٹا پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے اگر کوئی اُس پر ایمان نہ لائے۔ تو لعنت کا مستحق نہیں ہو جائے گا۔ اسپارٹا کے وجود پر شک کرنے کی وجہ سے ہرگز کوئی دوزخ کا کندا نہیں بن جا سکتا لیکن اگر ایک شخص دینی تعلیمات کی تصدیق نہیں کرے گا۔ تو اُس کے لئے ابدی عذاب ہے۔ جس بات کے نہ ماننے کی اتنی بڑی سزا ہو، ضروری ہے۔ کہ اس کے ماننے کے ذرائع و دلائل بھی اسی مناسبت سے قطعی اور واضح ہوں۔"

کوئی بات بھی جو ہماری چشم دید نہیں ہے، بغیر معقول دلیل کے ثابت نہیں ہوسکتی - اور ہر بڑی سے بڑی روایت بھی صدق و کذب کی محتمل ہے . . . "

" اگر معجزات خود میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہوتے، جب بھی میں اس غیر معقول طریق ایمان سے انکار کر دیتا۔ سحر کی تصدیق میرے لئے اس سے کہیں آسان ہے کہ خدا کے کلمہ کی غیر معقول طریقہ پر تصدیق کروں۔"

موجودہ مسیحیت

اس کے بعد روسو موجودہ مسیحی دین پر اظہار خیال کرتا ہے:

"اسقفوں اور پادریوں نے مسیحیت کو اس کی اصلی روح سے محروم کر دیا ہے۔ اب یہ سوال نہیں کیا جاتا کہ ایک مومن فرائض و واجبات کہاں تک انجام دیتا ہے؟ اور نیکی میں اس کی دوڑ کہاں تک ہے؟ سوال صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ کس فرقہ کے خرافات (جنہیں غلط طور پر "عقائد" کا نام دے دیا گیا ہے) مانتا ہے؟ وہ کیتھولک ہے یا پروٹسٹنٹ؟ تم سے یہ کوئی نہیں پوچھے گا کہ خدا سے ڈرتے بھی ہو یا نہیں؟ لیکن ہر کوئی اس بات پر تمہاری جان لینے کے لئے تیار ہو جائے گا کہ تم فلاں ولی کی کرامت کے قائل بھی ہو یا نہیں؟ - دین اپنی اصلی شکل میں صاف سادہ، سمجھ آنے والا تھا۔ ان جبہ پوشوں نے خرافات و مزخرفات اور غیر مفہوم قیل و قال کا غیر مرتب مجموعہ بنا دیا ہے - اگر تم اس تمام کثافت سے جو آجکل دین کے نام سے موسوم ہے، از سر تا پا آلودہ ہو، تو بس، تم مومن کامل ہو۔ اب تمہیں کسی نیکی کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ سیدھے آسمان کی بادشاہت (جنت) میں داخل ہو جاؤ گے!"

"انسانی جماعت کو دین سے کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے، جبکہ دین اتنی پست سطح پر آجائے؟ اس صورت میں دین کا مقصد کیا رہ جاتا ہے؟ صرف یہ کہ انسانوں میں بغض و عداوت کی تخم ریزی کرے، اور خونریز میدانوں کا سامان بہم پہنچایا کرے۔ بلاشبہ جب دین اس حالت میں آجائے۔ تو اس کے وجود سے اس کا عدم کہیں زیادہ بہتر ہے۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیئے۔ کہ دین کو اس پستی سے نکالیں۔ انسانیت کے نام پر حقوق ہیں۔ یہی حقوق ہمیں مجبور کرتے ہیں۔ کہ دین کو خرافات سے پاک کرکے اصلی صورت میں پیش کر دیں۔ تمہاری یہ سزائیں، دھمکیاں، پھانسیاں اور آگ کے شعلے ہمیں ہرگز مرعوب نہیں کر سکتے۔"

عہد جدید کی پیشین گوئی

جب لوگوں کی آنکھوں پر سے پردہ اٹھے گا اور حقیقت نظر آئے گی۔ تو بلاشک و شبہ وہ موجودہ دین کو حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیں گے۔ کیونکہ یہ حقیقی دین نہیں ہے وہ سب سے پہلا کام یہ کریں گے۔ کہ ان خود غرض اور ریاکار پیشواؤں کے احترام سے انکار کر دیں۔ وہ ان سے کہیں گے:۔ تم ہی نے ہمارا دین بگاڑا۔ اور تم ہی ہماری شقاوت کا سبب ہو۔ جب وہ مبارک زمانہ آئے گا۔ تو اس کا سب سے زیادہ مبارک عمل یہی ہوگا۔"

خاتمہ

اپنا جواب روسو اس عبارت پر ختم کرتا ہے:۔

"اے اسقفِ اعظم! تم اور تمہارے گروہ کے لئے باتیں بنانا بہت آسان ہے۔ تم لوگ اپنے حقوق کے سوا دوسروں کے حقوق نہیں جانتے۔ تمہیں صرف وہی قانون معلوم ہیں جن سے غیروں کو جکڑتے ہو۔ خود اپنے نفس کے مقید کرنے والے

قانون تمہاری کتاب میں نہیں لکھے گئے۔ تم صرف اتنے ہی پہ قانع نہیں ہو۔ کہ عدالت و انصاف سے بالاتر رہو، بلکہ انسانی عواطف و جذبات کا بھی اپنے تئیں پابند نہیں سمجھتے۔ تم کمزور پہ تکبر سے ظلم کرتے ہو، اور تم سے کوئی باز پرس نہیں کرتا۔ لوگوں کی توہین تمہارے لئے ویسی ہی آسان ہے، جیسی ان کے لئے تمہاری سنگ دلی سہل ہے۔ تم ہمیں اس طرح روندتے ہو۔ جس طرح خاک روندی جاتی ہے تم کبھی ہمیں آگ میں جلاتے ہو۔ کبھی سولی پہ چڑھاتے ہو، کبھی صرف توہین و تذلیل پر اکتفا کر لیتے ہو۔ تمہارے قہر و غضب کے لئے ضروری نہیں۔ کہ ہم سے کوئی خطا بھی سرزد ہوئی ہو۔ اگر تمہاری مصلحت کا اقتضا یہی ہے۔ تو پھر اثبات جرم کے لئے کسی بات کی ضرورت نہیں۔ اور ہمیں شکایت کرنے کی بھی اجازت نہیں۔ اگر ہم اس کی جرأت کریں۔ کہ اپنی براءت اور تمہاری غلطی ظاہر کریں۔ تو ہم گستاخی کے مجرم قرار دئے جاتے ہیں!"

اسقف سے آخری خطاب

"اے میرے آقا! آپ نے مجھ پر علانیہ طعن و تشنیع کی۔ بلکہ مجھے گالیاں بھی دے ڈالیں۔ اگر میری طرح آپ بھی کوئی معمولی آدمی ہوتے۔ اور میں اپنی کتاب کے ساتھ آپ کو عدالت کے سامنے لے جا سکتا، تو آپ دیکھ لیتے کہ عدالت کا فیصلہ آپ کے حق میں اتنا ہی سخت ہوتا، جتنا سخت یہ گناہ ہوا ہے۔ لیکن آپ ایک ایسی جماعت میں سے ہیں، جو منصف و عادل ہونے سے ہمیشہ کے لئے مستثنیٰ کر دی گئی ہے۔ رہا میں، تو میں ایک محض بے حقیقت آدمی ہوں۔ مجھے اتنا اور کہنے کی اجازت دیجئے۔ کہ آپ دینی پیشوا ہیں۔ انجیل کے عالم

ہیں۔ آپ کا فرض ہے۔ کہ مخلوق کو اُس کے فرائض کی تعلیم دیں۔ لیکن یہ تعلیم خود اپنے نفس سے شروع ہونی چاہیئے۔ آپ کو ایک لمحہ کے لئے سوچنا تھا۔ کہ میرے معاملہ میں آپ کا فرض کیا تھا، اور کہاں تک تھا۔ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اب کچھ کہنے کو باقی نہیں رہا، اِس لئے چُپ ہو جاتا ہوں!"

نپولین

انسانی عظمت اور اخلاقی زندگی

انسان ذہن و جسم کی کتنی ہی عظمتیں حاصل کر لے، لیکن روح اور اخلاق کی ادنیٰ سے ادنیٰ پاکیزگی بھی حاصل نہیں کر سکتا۔ اگر اُس کا اعتقاد اور عمل روحانی ہدایت کی روشنی سے محروم ہے!

انسان کے لئے یہ سہل ہے۔ کہ تمام دنیا فتح کر لے۔ سکندر نے دنیا کی تمام سلطنتیں تہ و بالا کر ڈالی تھیں۔ انسان کے لیے یہ بھی دشوار نہیں۔ کہ ذہن و فکر کی ایسی بلندیوں تک پہنچ جائے۔ جہاں تک دوسروں کے قدم نہ پہنچ سکے ہوں۔ ارسطو، اقلیدس، سولن اور سینیکا۔ جیسے فاتحین علم کی فتح مندیاں لازوال ہو چکی ہیں۔ اور دنیا منطق، ریاضی، قانون، اور فلسفۂ اخلاق میں آج تک ان کی پیرو ہے۔ انسان کی اولوالعزمی ان بلندیوں پر بھی نہیں رکتی کچھ مشکل نہیں۔ اگر وہ آگ کے شعلوں میں کود پڑے۔ سمندر کی موجوں کی ہنسی اڑائے، پہاڑوں کی صفیں چیر ڈالے، لیکن ہاں، یہ مشکل ہے، بہت ہی مشکل ہے۔ کہ وہ اخلاقی اور روحانی پاکیزگی کی راہ میں اپنی کسی ایک خواہش

نفس کا بھی مقابلہ کر سکے۔ اس کی ساری اولوالعزمی اور کوہ ہمتی جو دُنیا کی ساری رکاوٹوں کا تن تنہا مقابلہ کر سکتی ہے، ہوائے نفس کی ایک ادنیٰ سی رکاوٹ بھی اپنی راہ سے ہٹا دینے پر قادر نہیں ہوتی۔ سکندر تمام دُنیا کی تسخیر کی محنت سے نہیں تھکا، لیکن بابل کی ایک عورت جب اس کے سامنے آئی، تو اپنی خواہشِ نفس کے اضطراب سے بے بس ہو کر گر گیا۔ سقراط نے تمام نوعِ انسانی کو اخلاق، اور اخلاقی سعادت کی دعوت دی۔ لیکن خود اپنے آپ کو ایک دوسرے انسان کی منکوحہ عورت سے باز نہ رکھ سکا۔ ارسطو کے دامنِ علم کے دیتے بھی دُنیا گن چکی ہے، اور یونان کی ایک قدیم ضرب المثل ہمیں بتلاتی ہے "بڑا انسان بنو۔ اگر نیک انسان نہیں بن سکتے۔"

فی الحقیقت انسانی زندگی کی یہی اخلاقی اور عملی نامرادی ہے، جو الہامی ہدایت کی کسی بالاتر قوت کی ضرورت تسلیم کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ انسان اپنے ذہن وجسم کی قوتوں سے سب کچھ کر لے سکتا ہے۔ لیکن تکلف اور بناوٹ سے بھی اپنے آپ کو نیک نہیں بنا سکتا۔ اگر انسانی زندگی کی سعادت کے لئے اُس عملی صداقت کی کچھ بھی ضرورت ہے۔ جسے نیکی کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تو ناگزیر ہے۔ کہ عام انسانی سطح سے کوئی بلند تر ذریعہ ارشاد و ہدایت کا ہو۔ مذہب اور الہام اسی ذریعہ ہدایت کا نام ہے۔

نپولین اعظم

اٹھارھویں صدی میں نپولین بونا پارٹ کا ظہور بھی انسانی اولوالعزمی کا ایک عظیم ظہور تھا۔ شاید ہی یورپ کے کسی انسان کی نسبت دنیا نے اس قدر کہا اور سُنا ہو، جس قدر اس غیر معمولی انسان کی عجیب وغریب دماغی قوتوں کی نسبت کہہ سُن چکی ہے۔ تاہم انسانی عظمت کی اخلاقی نامرادی کا یہ کیسا عبرت انگیز منظر ہے۔ کہ یہی نپولین جب میدان جنگ سے باہر اپنے گھر کی محفوظ زندگی میں دیکھا جاتا ہے، تو اس میں اتنی قدرت بھی نظر نہیں آتی۔ کہ نہایت ادنے درجے کی اخلاقی کمزوریوں سے اپنے آپ کو باز رکھے!

حال میں جرمنی کے ایک اہل قلم گیرٹرڈ ایرٹز نے ایک کتاب "نپولین اور اس کی دوست عورتیں" لکھی ہے۔ اور اس میں مستند تاریخی ذرائع سے وہ تمام شہادتیں جمع کر دی ہیں، جو نپولین کی عاشقانہ بوالہوسیوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہو گیا ہے، اور دو تین ہفتہ سے انگلستان اور یورپ کے اکثر اخبارات و رسائل کا موضوع بحث ہے ہم اس کی بعض تاریخی داستانیں قارئین الہلال کی عبرت و بصیرت کے لئے درج کرتے ہیں۔

سولہ برس کی عمر میں عشق

محبت کے باب میں نپولین کی طرف یہ قول منسوب کیا جاتا ہے۔ کہ محبت

کا ئل آدمی کا دل بہلا وا ہے "۔ ممکن ہے ! نپولین نے یہ اُس وقت کہا ہو جب وہ پاک دامن تھا۔ لیکن لبعد میں ـــــ اگر مخالف مؤرخین کی روایت تسلیم کرلی جائے تو ـــــ اُس نے اس قول کی بنا پرحسن و ہوس کی زندگی سے اجتناب نہیں کیا' وہ ہمیشہ کسی نہ کسی حسینہ سے وابستہ رہا۔

آغازِ شباب میں نپولین مارسیلنراور پیرس کی سڑکوں پر پھٹے پرانے کپڑے پہنے پھرا کرتا تھا۔ نہ تو اُس کی ہیئت سے کسی کو دولت مندی کا شبہ ہو سکتا تھا' نہ اُس میں ظاہری حسن و جمال ہی کچھ ایسا غیر معمولی تھا۔ کہ کسی کو اپنی طرف متوجہ کرلے۔ تاہم یہ واقعہ ہے۔ کہ اُس زمانہ میں بھی بکثرت عورتیں اُس پر عاشق ہوگئی تھیں۔ کیونکہ فی الواقع اُس میں کوئی ایسی نامعلوم کشش موجود تھی' جو دلوں کو لبھالیتی تھی۔ ممکن ہے' اُس کا شرمگیں انداز اور اُس کے پُر غور چہرہ کی عجیب اداسی اُس کے دیکھنے والوں کے دلوں میں محبت پیدا کردیتی ہو۔

کہا جاتا ہے۔ کہ نپولین سولہ برس کی عمر میں جب والنسا میں رہتا تھا' تو وہاں کی بہت سی حسین عورتیں اُس پر فریفتہ ہوگئی تھیں۔ مگر خود اُسے بجز ایک کے کسی سے دلچسپی نہیں ہوئی۔ اس دوشیزہ کا نام "کارولین کولومبیا" تھا۔ وہ نہایت نازک اندام اور خوبصورت تھی۔ ایک مرتبہ خود نپولین نے اِس لڑکی کے متعلق کہا تھا۔ اُس وقت دُنیا میں کوئی دو شخص ایسے خوش نصیب نہ تھے' جیسے ہم دونوں تھے۔ ہم ایک ایسی پاک محبت کے مزے لوٹ رہے تھے' جیسی خواب میں بھی کسی انسان نے نہ دیکھی ہوگی ۔ ۔ ۔ ۔ اکثر ہم دونوں باغوں میں چلے جاتے اور درختوں پر چڑھتے اترتے۔ بارہا ہم دن دن بھر مخلوق کی نظروں

اور شہر کے شور و غل سے دُور بیٹھے باتیں کیا کرتے تھے۔

لیکن اشتدادِ زمانہ نے نپولین کے دل سے اس دوشیزہ کی یاد محو کر دی۔ اور اُسے اپنی ایک ہم وطن لڑکی سے عشق ہو گیا۔ نپولین شروع ہی سے مستبد تھا اُس نے اپنی محبوبہ کو سختی سے حکم دے دیا۔ کہ اُس کے سوا کسی کو بھی مسکرا کر نہ دیکھے۔ لڑکی کے دل میں اس جابرانہ حکم سے نفرت پیدا ہو گئی، اور اُس کے پنجہ سے نکلنے کے لئے اُس نے ایک دن شراب میں زہر ملا دیا۔ اور نپولین مرتے مرتے بچا!

ادھیڑ عورت سے عشق

اس واقعہ سے کچھ عرصہ بعد نپولین کو ایک ادھیڑ عورت "میڈیم پرمون" سے محبّت ہو گئی، اور اس قدر بڑھی۔ کہ ایک لمحہ بھی اُس کی جدائی گوارا نہ تھی۔ ایک دن نپولین نے اُس سے باضابطہ شادی کر لینے کی درخواست کی۔ عورت نے اس خواہش پر زور سے قہقہہ لگایا "تم بیوقوف ہو گئے ہو! مضحکہ بننا چاہتے ہو! بھلا لوگ کیا کہیں گے؟ بیوی ہونے کے بجائے میں تمہاری ماں بننے کے زیادہ قابل ہوں!" نپولین پر یہ بات بہت ناگوار گزری اور قطع تعلق کر لیا۔

نپولین کا طریق محبّت

ایک مورخ کا بیان ہے۔ کہ نپولین نے بے شمار عورتوں کا دل توڑا ہے۔ اُس کی عادت تھی۔ کہ تعلقات بڑھاتے جاتا تھا۔ اور جب عورت اُس کے دام محبت

میں پھنس جاتی تھی، تو بے اعتنائی سے بالکل چھوڑ دیتا تھا۔ چنانچہ "میڈیم والسکا" پولینڈ کی ایک حسینہ کا واقعہ اس بات کا کافی ثبوت ہے۔ نپولین نے اس عورت کو دیکھا۔ اور لبھانا چاہا۔ مگر اُس نے سخت نفرت کا اظہار کیا۔ نپولین نے اُسے قبضہ میں لانے کی بہت کوشش کی، مگر وہ برابر بیزار رہی۔ آخر ایک دن غضبناک ہو کر چلایا "تو دیکھ لے گی۔ میں تجھے کس طرح زیر کرتا ہوں! تجھے میرے ارادہ کے سامنے جھکنا پڑے گا! دیکھ، یہ میرے ہاتھ میں گھڑی ہے، جس طرح میں یہ گھڑی چُور چُور کئے ڈالتا ہوں۔ اُسی طرح پولینڈ کا ملک بھی پاش پاش کر کے پھینک دوں گا!" اُس نے یہ کہا اور گھڑی زور سے دیوار پر مار دی۔ اِس حرکت کا عورت پر اتنا شدید اثر ہوا۔ کہ وہ بے ہوش ہو کر نپولین کے قدموں پر گر پڑی۔ لیکن چند دنوں کے بعد نپولین نے اُسے اُکتا کر چھوڑ دیا!"

محبّت میں استبداد

عشق و محبّت کے میدان میں بھی اِس شخص کے ظلم و استبداد کے قصے مشہور ہیں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے۔ کہ غربت کے زمانہ میں جب نپولین اور اُس کا بھائی مارسیلز کے بازاروں میں پھرا کرتے تھے، اتفاق سے ریشم کے ایک سوداگر "فرانسوا کلاری" کے خاندان سے اُن کا تعارف ہو گیا۔ اس تاجر کی دو لڑکیاں تھیں۔ بڑی کا نام "جولیا" تھا چھوٹی کا "ڈیزیرا"۔ نپولین نے شروع میں جولیا کو پسند کیا اور اُس کے بھائی نے "ڈیزیرا" کو۔ تھوڑے دن بعد نپولین اپنی محبوبہ سے سیر ہو گیا اور بھائی کی محبوبہ پر قبضہ جمانا چاہا۔ چنانچہ ایک موقعہ پر جب یہ چاروں عاشق

معشوق جمع تھے، نپولین نے حکمانہ انداز میں کہا "جوزف! تم اور تمہاری محبوبہ دونوں غیر مستقل مزاج ہیں۔ لیکن مجھ میں اور میری محبوبہ میں استقلال ہے بہتر یہ ہے۔ کہ ہم تم مبادلہ کرلیں۔ تاکہ تمہارا نقص جو لیا پورا کر دے، اور میں ڈیزیرا کی کمی پوری کر دوں" یہ عجیب و غریب فلسفہ بیان کرکے اس نے اپنے بھائی کی محبوبہ کو اپنے پہلو میں بٹھالیا۔ اور کسی کو بھی مخالفت کی جرأت نہ ہوئی!"

لیکن تھوڑے ہی زمانہ کے بعد نپولین نے محسوس کیا۔ کہ عزت و عظمت کی راہیں اس کے سامنے کھلی ہوئی ہیں۔ لہذا ڈیزیرا کو یک قلم چھوڑ دیا۔ اور اس کی منتوں اور آنسوؤں کا ذرا بھی خیال نہ کیا۔

جوزفائن سے عشق

اس کی طبیعت کچھ ایسی بے چین واقع ہوئی تھی۔ کہ ایک ہی حالت پر چلے جانا اسے پسند نہ تھا۔ سابق محبت سے دست بردار ہونے کے تھوڑے ہی دنوں بعد وہ جوزفائن پر فریفتہ ہو گیا۔ واقعہ یہ ہے۔ کہ اکتوبر ۱۷۹۵ء میں جب نپولین بام عزت کی ابتدائی سیڑھیوں پر تھا۔ اس کے پاس ایک کم عمر لڑکا آیا، اور اپنے باپ کی تلوار واپس مانگی۔ یہ لڑکا فرانس کے مشہور سپہ سالار وائکونٹ الکزنڈر کا بیٹا تھا۔ جسے فرانسیسی انقلاب کے زمانے میں پھانسی دی گئی تھی۔ نپولین بچہ کی جرأت و فصاحت سے بہت خوش ہوا۔ اور اس کی درخواست منظور کرلی۔ دوسرے دن اس کی ماں شکریہ ادا کرنے آئی۔ یہی جوزفائن تھی۔ نپولین پہلی ہی نظر میں اس پر عاشق ہو گیا۔

مؤرخین کا بیان ہے۔ کہ دوسرے دن خود نپولین جوزیفائن کے چھوٹے سے مکان پر گیا۔ جوزیفائن واقعی بہت خوبصورت تھی، ساتھ ہی عقلمند بھی تھی اُس نے محسوس کر لیا۔ کہ نپولین اُس کی چشم و ابرو کا شکار ہوگیا ہے۔ چونکہ اسراف کی وجہ سے سابق شوہر کی تمام دولت خرچ کر کے مقروض ہو چکی تھی، اِس لئے اس نے بھی اس نئی دعوتِ عشق کا پوری سرگرمی سے استقبال کیا۔ اور تعلقات بڑھانا شروع کر دئے۔ چند ماہ کی آمد و رفت کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ مارچ ۱۷۹۶ء میں جنرل بونا پارٹ اور جوزیفائن کی شادی ہوگئی۔ دلہن کی عمر دولہا سے سات سال زیادہ تھی، مگر نکاحنامہ میں اُس کی عمر ۲۹ برس لکھی گئی اور نپولین کی ۲۶ برس!"

شادی کے دو دن بعد نپولین کو اٹلی کے حملہ پر جانا پڑا۔ سخت مصروفیت تھی مگر جوزیفائن کی یاد ہر وقت تازہ رہتی تھی۔ ہر منزل پر سے خط کے ساتھ قاصد بھیجتا، اور اپنی حالت سے اُسے آگاہ کرتا رہتا تھا۔ پہلے خط میں لکھا تھا "جب جب اپنے دل پر ہاتھ رکھتا ہوں، تم اُس میں موجود ملتی ہو جس سے مجھے بڑی تسکین ہوتی ہے۔ اس دنیا میں اگر کوئی غم ہے۔ تو صرف تمہاری فرقت کا۔"

جوزیفائن کی تصویر ہر وقت اُس کے پاس رہتی تھی۔ جب کبھی پڑاؤ ڈالتا تھا۔ تصویر نکال کر سامنے رکھ لیتا تھا۔ جب کوچ کرتا تھا۔ تصویر جیب میں رکھ لیتا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کرونیس میں اُس کے ہاتھ سے تصویر کا آئینہ چھوٹ کر ٹوٹ گیا۔ اِسے اُس نے فالِ بد سمجھا۔ قریب تھا ۔ کہ

جوزیفائن کی طرف سے بالکل ناامید ہو جاتا۔ مگر اُس نے فوراً خط لکھا۔" کاش تمہارے پَر ہوتے۔ اور تم اُڑ کر میرے پاس آ جاتیں!"

لیکن جوزیفائن اپنی رنگ رلیوں میں مصروف تھی۔ نپولین کی اُسے ذرا بھی پرواہ نہ تھی۔ اب اُسے پایۂ تخت میں بڑی عزت حاصل ہو گئی تھی۔ اچھے اچھے لوگ اُس کی خوشامد میں لگے تھے۔ چند ہفتہ کے اندر نپولین نے نپولین نے اٹلی میں عظیم الشان فتوحات حاصل کر لیں اور اطمینان پا کر جوزیفائن کو بلا لینا چاہا۔ لیکن وہ برابر حیلے حوالے کرتی رہی۔ آخر نپولین نے سختی سے لکھا۔ کہ فوراً چلی آؤ۔ اِس مرتبہ اس نے ایک نیا عذر پیش کیا۔ اُس نے لکھا۔ کہ مَیں سفر نہیں کر سکتی۔ کیونکہ حمل سے ہوں۔ نپولین کو اس جھوٹی خبر سے بڑی ہی خوشی ہوئی۔ اُس نے فوراً خط لکھا۔ "جوزیفائن! مَیں نے سخت غلطی کی۔ کِس طرح اپنے گناہ کا کفارہ کروں؟ مَیں نے ناحق شک کیا حالانکہ تم بیمار تھیں۔ سچ ہے، محبت انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔ . . . کاش ایک ہی دن کے لئے مَیں تمہارے پہلو میں ہوتا!"

نیز اپنے بھائی کو لکھا۔ "جوزیفائن کی علالت نے میرے ہوش اُڑا دئے ہیں۔ کاش مَیں اُسے لکھ سکتا۔ اُس کی محبت جنون کے درجہ تک پہنچ گئی ہے۔ مَیں اُس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ خدانخواستہ اگر وہ مر گئی۔ تو زندگی میں میرے لئے کوئی لطف باقی نہیں رہے گا!"

لیکن چند ہی دن بعد نپولین کو معلوم ہو گیا۔ کہ جوزیفائن نے دھوکا دیا تھا۔ وہ بالکل اچھی ہے۔ اور پیرس میں ضیافتیں دے رہی ہے۔ اب اُس

غصہ کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اُس نے فوراً تلخ لہجہ میں خط لکھا، اور حکم دیا کہ بلا کسی عذر کے روانہ ہو جائے۔ جوزیفائن بادلِ نخواستہ روانہ ہو گئی۔ میدان میں نپولین نے بڑی مسرت سے استقبال کیا۔ مگر چند ہی دن بعد اُسے پھر میدانِ جنگ میں جانا پڑا۔ کیونکہ فوج ایک خطرہ میں پھنس گئی تھی۔ خطرہ دور کر کے اُس نے پھر اُسے طلب کیا۔ خط میں لکھا تھا۔ "جدائی کے وقت تمہارے آنسوؤں نے میرے دل کو سخت مایوس کر دیا تھا۔ میری عقل جاتی رہی تھی اب یہاں میرے پاس آ جاؤ، تاکہ مرنے سے پہلے ہم کہہ سکیں۔ کہ ہم نے بھی چند دن خوشی کے دیکھے ہیں" مؤرخ میسن کا بیان ہے۔ کہ نپولین، جوزیفائن کے سامنے اس طرح کھڑا ہوتا تھا، گویا کسی مقدس دیوی کے حضور میں کھڑا ہے!

نپولین کا رقیب

جوزیفائن اپنے شوہر کے حسب الحکم جنگی پڑاؤ میں آ گئی۔ یہاں چارلس نام فوج میں ایک کم رتبہ افسر تھا۔ کم عمر اور خوبصورت تھا۔ حتیٰ کہ کہا جاتا ہے، نپولین کی فوج میں اُس سے زیادہ حسین آدمی کوئی نہ تھا۔ جوزیفائن اُسے دیکھتے ہی فریفتہ ہو گئی۔ یا تو فوج میں رہنے سے بیزار تھی، یا اب فوج سے جدا ہونا گوارا نہیں کرتی تھی۔ دونوں میں شناسائی ہوئی، تعلقات بڑھے، اور اتنے بڑھے۔ کہ خود نپولین نے محسوس کر لیا۔ وہ نہایت غصہ ہوا۔ مگر ضبط سے کام لیا۔ البتہ اتنا ضرور کیا۔ کہ اپنے رقیب کو فوج سے نکال کر پیرس بھیج دیا اور حکم دیا۔ کہ آئندہ احکام کا منتظر رہے۔ اپنے شوہر کی اس کارروائی سے

جوزیفائن کو سخت صدمہ ہوا۔ مگر مجبور تھی۔ کچھ کر نہیں سکتی تھی۔ وہ اپنی پھوپھی کو ایک خط میں لکھتی ہے۔ زندگی سے اُکتا گئی ہوں۔ موت کی تمنائیں کر رہی ہوں بہ"

جنگِ اٹلی سے فارغ ہوکر دونوں میاں بیوی بڑی شان و شوکت سے پیرس لوٹے۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد نپولین کو پھر جوزیفائن سے علیحدہ ہونا پڑا۔ وہ مصر کی مہم پر روانہ ہوگیا، اور بیوی سے وعدہ لے لیا۔ کہ جنگ ختم ہوتے ہی مصر چلی آئے گی۔ مگر ابھی وہ مالٹا ہی پہنچا تھا۔ کہ عیش پسند عورت نے خاوند کو یک قلم بھلا دیا۔ اور جلسے شروع کر دئے۔ نپولین اب فرانس میں اس قدر ہر دلعزیز ہوگیا تھا۔ کہ اُس کی بیوی کی آزادیوں پر تمام پیرس ملامت کر رہا تھا۔ مگر خود اُسے کچھ پرواہ نہ تھی۔ بہت جلد نپولین کو تمام روداد معلوم ہوگئی۔ کہا جاتا ہے۔ کہ اِسی زمانہ میں اُسے سب سے پہلے جوزیفائن کو طلاق دینے کا خیال پیدا ہوا تھا۔

جوزیفائن سمجھتی تھی۔ کہ نپولین شاید کبھی واپس نہ آئیگا، یا بہت مدت کے بعد آئیگا۔ اِسی لئے بالکل بے باک ہوگئی تھی۔ مگر اچانک اُسے خبر ملی۔ کہ اُس کا شوہر مصر سے آگیا ہے۔ اور عنقریب پیرس پہنچنے والا ہے۔ بہت خوفزدہ اور پریشان ہوئی۔ ایک طرف اپنی بے اعتدالیوں کا خوف تھا۔ دوسری طرف سخت مقروض بھی ہوگئی تھی۔ حیران تھی۔ شوہر کو کیا جواب دے گی؟ مگر تھی چالاک۔ فوراً پیرس سے استقبال کے لئے روانہ ہوگئی۔ نپولین کو بھی اُس کی روانگی کی خبر مل گئی تھی۔ اُس نے بالکل مختلف راستہ اختیار کیا۔ اور محل

میں آکر تمام دروازے بند کر لئے۔ جوزیفائن اپنی تدبیر میں ناکام ہوکر عشرت سے لوٹی۔ اور سیدھی محل کی طرف روانہ ہوگئی۔ مورخ بیسن کا بیان ہے "جوزیفائن محل کے دروازہ پر کھڑی دستکیں دیتی رہی۔ مگر نپولین نے کوئی شنوائی نہیں کی۔ پھر اُس نے اپنے گھٹنوں پہ جھک کر پھوٹ پھوٹ کے رونا شروع کیا مگر اس پر بھی سپہ سالار نے مطلقاً پرواہ نہ کی۔ اس حالت پہ پورا دن گزر گیا مگر دروازہ نہیں کھلنا تھا۔ نہیں کھلا۔ اب جوزیفائن بالکل تھک گئی۔ ناامید ہوکر واپس جانے والی تھی۔ کہ اُس کی ایک سہیلی اُس کے دونوں بچوں اوجین اور ہورٹانس کو لے آئی۔ انہوں نے رکوع کرکے اپنے سوتیلے باپ کو پکارنا اور اپنی ماں کے لئے رو رو کر سفارشیں کرنا شروع کیا۔ معصوم بچوں کی آواز سن کر نپولین کا دل نرم پڑ گیا۔ اور دروازہ کھول دیا۔ پھر جوزیفائن کو اُٹھایا۔ آنسو پونچھے، معاف کیا۔ اور اُس کا بیس لاکھ فرانک قرضہ بھی ادا کر دیا۔"

جوزیفائن کو طلاق

اس کے بعد جوزیفائن نپولین کے ساتھ رہی۔ جب وہ تخت نشین ہوا تو اُس نے ملکہ فرانس کا تاج پہنا۔ اور شہنشاہی کی عزت و عظمت کے ساتھ زندگی بسر کرتی رہی۔ یہاں تک کہ نپولین کو اپنے بعد اپنے جانشین کی فکر ہوئی۔ اس خیال نے دوسرے سیاسی مصالح کے ساتھ مل کر اُسے جوزیفائن کی طلاق پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ طلاق دے دی گئی، اور نپولین نے شہنشاہ آسٹریا کی لڑکی میری سے شادی کر لی۔"

مشہور ہے۔ کہ آسٹرین بیوی کو اپنے شوہر سے ذرا بھی محبت نہ تھی۔ بلکہ سخت نفرت کرتی تھی۔ جیسا کہ ابھی بیان ہوگا۔ نپولین نے جزیرہ سینٹ ہیلانا میں بستر مرگ پر اپنے ڈاکٹر کو وصیت کی تھی۔ کہ موت کے بعد اُس کا دل شیشہ میں رکھ کر اُس کی بیوی کے پاس لے جائے۔ لیکن جب ڈاکٹر ملکہ کے پاس پہنچا تو اُسے ایک کانے عہدہ دار سے تعشق کرتے پایا۔ ملکہ نے نپولین کا پیغام سن کر کہا "میں نے اُس کی محبت کبھی اپنے دل میں محسوس نہیں کی۔ اگرچہ میں یہ ہمیشہ یاد رکھنے پر مجبور ہوں۔ کہ وہ میرے لڑکے کا باپ ہے۔"

میڈم پولین سے محبت

اس عورت سے نپولین کو مصر میں عشق ہوا تھا۔

گیرٹرڈ اربٹز (Gertrude Aretz) جس کی جدید الشیوع کتاب کا ذکر ان صفحات پر ہو چکا ہے، میڈم پولین کی نسبت لکھتا ہے:۔

اس معاملہ کی تفصیل یہ ہے۔ کہ ۹ رمئی ۱۷۹۸ء کو نپولین مصر کی فتح کے لئے روانہ ہوا۔ وہ اپنے دو دشمنوں سے بہت زیادہ خائف تھا، اور اُن کی آنکھ بچا کر نکل جانا چاہتا تھا۔ یعنی انگریزی امیر البحر نلسن، اور انگریزی جاسوس جان بارنٹ۔

اس سفر میں نپولین نے چند خاص عورتوں کے سوا عورتوں کی رفاقت ممنوع قرار دے دی تھی۔ جن عورتوں کو چلنے کی اجازت دی گئی تھی، اُن میں خود اُنکی کی داشتہ میڈم ورڈیا بھی تھی، جسے وہ اٹلی سے

اپنے ساتھ سے لایا تھا۔

اِس فوج میں لیوفوریس نامی ایک فوجی افسر تھا۔ اُس نے حال ہی میں شادی کی تھی۔ اُس کا دل اپنی بیوی کی جدائی پر کسی طرح راضی نہیں ہوتا تھا۔ مگر مشکل یہ تھی۔ کہ عورتوں کو ساتھ لے جانے کی ممانعت تھی۔ آخر اُس نے یہ ترکیب نکالی۔ کہ بیوی کو سپاہی کی وردی پہنا کر اپنے ساتھ لے لیا۔ تاکہ دونوں بے روک ٹوک ساتھ رہ سکیں!"

اُس وقت کے اکثر مؤرخین کا بیان ہے۔ کہ ماہ اگست میں نپولین نے قاہرہ کے باہر ایک جلسہ کیا تھا۔ جس میں اُس کا پورا جنگی اسٹاف اور تمام عورتیں شامل تھیں۔ اسی جلسہ کے موقعہ پر نپولین نے میدان میں اپنی فوج کا ایک دستہ گدھوں پر سوار دیکھا۔ سپاہیوں میں ایک شخص غایت درجہ خوش آواز، خوبصورت اور دلربا تھا۔ نپولین نے جنرل برتیہ کو حکم دیا۔ کہ اِس شخص کا پتہ لگائے۔ اُسی دن شام کو جنرل نے یہ عجیب خبر سنائی "کہ وہ سپاہی مرد نہیں ہے عورت ہے۔ اور بائیسویں رسالہ کے ایک افسر کی بیوی ہے"

دوسرے دن نپولین نے جنرل کو ایک دعوت منعقد کرنے کا حکم دیا۔ اِس میں بڑے بڑے جنرل، افسر، اور ان کی عورتیں مدعو کی گئی تھیں۔ خصوصاً میڈم فوریس بھی خصوصیت کے ساتھ بلائی گئی تھی!"

چنانچہ دعوت کا جلسہ منعقد ہوا۔ میڈم بغیر اپنے شوہر کے بلائی گئی تھی۔

اُس کے شوہر نے شروع میں تو جانے سے منع کیا۔ لیکن پھر ڈرا، اور اجازت دے دی۔ چنانچہ تمام مہمان جمع ہوئے۔ حسب معمول نپولین برآمد ہوا۔ سب تعظیماً کھڑے ہو گئے۔ وہ لوگوں سے ہنستا بولتا جنرل تک پہنچا، جس کے پاس میڈم فوریس اور متعدد ممتاز سپہ سالار کھڑے تھے۔ جنرل قائدِ اعظم کا خیرمقدم بجالایا، تشریف آوری پر شکریہ ادا کیا، اور ایک پیالی چائے نوش کر لینے کی درخواست منظور ہوئی، اور نپولین بیٹھ گیا۔ میڈم بالکل اُس کے مقابل کھڑی تھی۔"

میڈم فوریس نے دیکھا، سپہ سالار اُسے پُر معنی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ وہ بہت کم عمر تھی۔ شرما گئی۔ نپولین اُس کی حالت کا بغور مطالعہ کرتا رہا، مگر بالکل خاموش رہا۔ چائے جلدی سے پی لی اور بغیر ایک لفظ کہے جلسے سے اُٹھ گیا۔

مہمانوں نے رات کا کھانا کھایا، اور کافی پینے لگے۔ میڈم فوریس جس میز پر تھی، اُس کے ایک طرف جنرل ڈی بوی بیٹھا تھا۔ دوسری طرف جنرل جونو۔ آخر الذکر نے کافی کی بھری ہوئی پیالی جان بوجھ کر اس طرح میڈم فوریس پر گرا دی، کہ سب نے اُسے اتفاقی حادثہ سمجھا۔ لوگ لپکے اور خاتون کا لباس صاف کرنے لگے۔ جنرل جونو نے اپنی غفلت پر بڑی فصاحت سے ندامت کا اظہار کیا۔ فوراً کافی کا دھبہ پانی سے دھلوایا گیا۔ جس سے میڈم کا لباس اور زیادہ بھیگ گیا۔ اِس پر جنرل نے کہا "آپ کپڑا خشک کرنے کے لئے مکان کی بالائی منزل پر چلی جائیے۔" میڈم فوریس چلی گئی۔ وہاں نپولین

منتظر بیٹھا تھا!

دعوت کے تیسرے دن میڈم کے شوہر فوریس کو حکم ملا۔ کہ جنرل برتیہ سے ملاقات کرے۔ جنرل نے بڑی بشاشت سے افسر کا خیر مقدم کیا۔ اور کہا۔ دوست! تم بڑے ہی خوش نصیب ہو۔ کیونکہ فرانس جا رہے ہو۔ سپہ سالار تمہیں ایک خفیہ مہم پر پیرس بھیج رہا ہے۔ ایک گھنٹہ کے اندر روانہ ہو جاؤ یہ لو، اسکندریہ کے سپہ سالار کے نام حکم ہے۔ کہ تمہارے سفر کے لئے ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچا دے۔"

فوریس بدحواس ہوگیا۔ حیران تھا، کیا جواب دے؟ آخر کار افسردگی سے جنرل کا شکریہ ادا کیا اور کہا "اگر مجھے فوراً ہی روانہ ہو جانا ہے۔ تو میں اپنی بیوی کو بھی ساتھ لے جاؤنگا۔"

جنرل نے غصہ سے کہا "بیوی! کیا تم یہ سمجھتے ہو۔ کہ ایک ایسے نازک کام میں اپنے ساتھ اپنی بیوی کو لے جا سکتے ہو؟ خصوصاً جبکہ راستہ میں انگریزی بیڑہ موجود ہے۔ اور تمہیں قید کر کے لے جا سکتا ہے؟

اب غریب فوریس کے لئے بجز اطاعت کے کوئی چارہ کار نہ تھا۔ ۲۰ دسمبر ۱۷۹۸ء کو اسکندریہ پہنچا اور فرانسیسی جہاز "شاسور" نامی پر سوار ہوگیا۔ اس جہاز کا کپتان لارنس تھا۔

لیکن فوریس یہ دیکھ کر نہایت متعجب تھا۔ کہ اس کا جہاز سیدھا راستہ اختیار کرنے کی جگہ کچھ عجیب پیچ و خم کے ساتھ جا رہا ہے۔ اس نے کپتان سے

پوچھا، تو اُس نے کہا۔ انگریزی بیڑہ ہر طرف منڈلا رہا ہے۔ اُس سے بچکر چلنا ضروری ہے۔"

کپتان دراصل سکھایا پڑھایا ہوا تھا۔ اُس سے کہہ دیا گیا تھا۔ کہ جہاز انگریزوں کے ہاتھ قصداً گرفتار کرا دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ چند دنوں کے بعد قوریس انگریزی بیڑہ میں قید تھا۔ انگریزی جنگی جہاز "لیون" نے فرانسیسی جہاز دیکھ لیا تھا۔ اور گرفتار کر لیا تھا!

یہ کہنا غیر ضروری ہے۔ کہ اس حادثہ سے غریب قوریس کو کس درجہ صدمہ ہوا ہ؟ ایک طرف اپنی رفیقِ حیات کی جدائی کا صدمہ مارے ڈالتا تھا۔ دوسری طرف اپنی سرکاری مہم کی ناکامی کا داغ تھا۔ وہ انگریزی جہاز "لیون" کے ایک کمرے میں مقید تھا۔ اور رہ رہ کر کپتان لارنس کو کوس رہا تھا۔ اگر اُس نے سمندر میں غلط راستہ اختیار نہ کیا ہوتا۔ تو یہ روزِ بد نہ دیکھنا پڑتا۔ بڑی مصیبت یہ تھی۔ کہ اب ایک بڑی مدت تک کے لئے وہ آزادی سے محروم ہو گیا تھا۔ کیونکہ وہ جنگی قیدی تھا۔ اس لئے اس کی رہائی صرف دو ہی صورتوں میں ہو سکتی تھی۔ یا تو دونوں حکومتوں میں صلح ہو جائے یا باہم دگر جنگی قیدیوں کا مبادلہ کیا جائے۔ لیکن یہ دونوں صورتیں قریب الوقوع نہ تھیں!

قوریس اپنے غم انگیز خیالات میں محو تھا۔ یکایک اُس کی کوٹھڑی کا دروازہ کھُلا، اور ایک انگریز داخل ہوا۔ یہ اس عہد کا مشہور انگریز جاسوس جان بارنٹ تھا۔ جسے نپولین تلسن سے کم خطرناک نہیں سمجھتا تھا۔

فوریس نے اُس کی صورت دیکھتے ہی خیال کیا۔ کہ غالباً یہ اِس مہم اوراس کے مقاصد کے نسبت سوالات کرے گا۔ جو سرکاری مراسلت لے کر فوریس فرانس جا رہا تھا، وہ گرفتاری کے وقت ہی اُس سے لے لی گئی تھی۔ سب سے زیادہ صدمہ اُسے اسی مراسلت کے دشمنوں کے ہاتھ پڑ جانے کا تھا۔ وہ اپنے دل میں کہنے لگا "نہیں معلوم اس مراسلت میں کیسے کیسے اہم راز ہونگے۔ جو افسوس کہ دشمنوں کے علم میں آگئے۔ بہر حال خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، مَیں ان کم بختوں کے سوالات کا کوئی جواب نہیں دوں گا۔"

لیکن شدتِ حیرت سے وہ مبہوت ہوگیا، جب اُس نے دیکھا۔ کہ جان بارنٹ نے وہی مراسلت جیب سے نکالی، اور فوریس کو دیتے ہوئے کہا:۔

"میرے دوست! یہ تمہارا سربمہر لفافہ موجود ہے۔ دیکھ لو! ہم نے کھولنے کی بالکل کوشش نہیں کی۔ اس کی تمام مہریں اپنی اصلی حالت میں قائم ہیں۔ ہمیں کوئی ضرورت نہ تھی۔ کہ اس کے مضامین سے واقف ہوں۔ یہ مراسلت تمہیں واپس دی جاتی ہے۔ اِسے لے لو۔ شاہی حکم کی رو سے اب تم آزاد ہو۔ تمہیں عنقریب مصر کے ساحل پر پہنچا کر رخصت کر دیا جائیگا"

یہ بات صورتِ حال کے اِس درجہ خلاف تھی، کہ کئی لمحہ تک فوریس باور نہ کرسکا۔ آخر اُس نے کہا:۔

"کیا آپ کا واقعی یہی مطلب ہے۔ کہ یہ مراسلت مَیں لے لوں، اور مجھے

مصر کے ساحل پہ اُتار دیا جائیگا؟"

"یقیناً" انگریز جاسوس نے مسکراتے ہوئے کہا "اس لئے کہ میرے دوست! جب تم قاہرہ واپس جاؤ گے، تو دیکھ لوگے۔ کہ تمہاری بیوی بوناپارٹ کی آغوش میں ہے!"

اصل واقعہ یہ ہے۔ کہ نپولین اور میڈم فوریس کے تعلقات کی پوری سرگزشت انگریزی جاسوس نے معلوم کر لی تھی۔ اسکندریہ اور دمیاط میں اُن کے آدمی موجود تھے، اور الفی بک مملوک کی اعانت سے تمام مصر کی خبریں معلوم کرتے رہتے تھے۔ جب جان بارنٹ کو معلوم ہوا۔ کہ نپولین نے فوریس کو اس لئے روانہ کر دیا ہے۔ تاکہ مصر سے دُور ہو جائے۔ اور وہ خود اُس کی بیوی کے ساتھ بے غل وغش عیش کرے۔ تو اُس نے انگریزی بیڑہ کے افسروں کو اس کی اطلاع دے دی۔ جب فرانسیسی جہاز کی گرفتاری کے بعد فوریس کا نام معلوم ہوا تو فوراً پہچان لیا گیا۔ کہ میڈم فوریس کا شوہر یہی ہے۔ وہ اُسے گرفتار رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ کیونکہ اس طرح وہ نپولین کے دلی مقصد کی تکمیل کر دیتے۔ اُنہوں نے فیصلہ کر لیا۔ کہ جہاں تک جلد ممکن ہو۔ اِسے مصر واپس کر دیا جائے، تاکہ نپولین کے سر پر مسلّط ہو جائے۔ انگریزوں کو یقین تھا۔ کہ فوریس جوشِ انتقام میں اپنے رقیب کو قتل کر ڈالے گا، اور اِس طرح اِس بلا سے اُنہیں نجات مل جائے گی۔

اُدھر مصر میں یہ ہوا کہ فوریس کے روانہ ہوتے ہی اُس کی بیوی نپولین کے قبضہ میں آگئی۔ اور شب و روز ساتھ رہنے لگی۔ نپولین کا اب اُس سے تعلق بالکل علانیہ تھا۔ چند دن بعد تمام فوج میں یہ خبر پھیل گئی، اور سپاہی میڈم کوٹ "ہماری مشرق کی ملکہ" کہہ کر پکارنے لگے!

لیکن ابھی چند ہفتے بھی اِس حالت پہ نہیں گزرے تھے۔ کہ اچانک فوریس قاہرہ پہنچ گیا۔ انگریزی جہاز نے نہ صرف اُسے مصر پہنچا دیا، بلکہ اسکندریہ میں ایک انگریزی جاسوس نے تمام ضروری معلومات بھی بہم پہنچا دیں۔ اُسے معلوم ہوگیا۔ کہ نپولین نے قاہرہ میں ایک خاص مکان اُس کی بیوی کے لئے مخصوص کر دیا ہے! اور وہ بڑے امیرانہ ٹھاٹھ سے وہیں رہتی ہے۔

وہ سیدھا اُس مکان کی طرف چلا۔ واقعی اُس کی بیوی قیمتی لباس میں ملبوس موجود تھی۔ شوہر کو اِس طرح اچانک دیکھ کر ڈر گئی، اور صاف صاف نپولین کے تعلقات کا اقرار کر لیا۔ اب فوریس کے لئے غیظ و غضب ضبط کرنا ناممکن تھا۔ اُس نے بے تحاشہ مارنا شروع کر دیا۔ یہانتک کہ مارتے مارتے تھک گیا۔ اور عورت بے دم ہو کر گر پڑی۔

اِس کے بعد کیا واقعات پیش آئے؟ اُن کی تفصیلات تاریخ تک نہیں پہنچ سکیں۔ لیکن دو باتوں کا نپولین کے وقائع نگاروں نے ذکر کیا ہے ایک یہ کہ فوریس نے طلاق کی درخواست پیش کر کے اپنی بیوی سے علیحدگی کر لی تھی۔ دوسری یہ کہ فوریس مصر سے فرانس واپس آکر عرصہ تک

زندہ رہا تھا۔

جان بارنٹ کا خیال تھا۔ کہ نوریس نپولین کو قتل کر ڈالے گا۔ لیکن نپولین ایسی ہستی نہ تھی۔ جو اس آسانی سے قتل کر ڈالی جاتی ابھی اُسے زندہ رہنا تھا۔ اور تمام یورپ کو منقلب کر دینا تھا۔

رستم بن رضا

نپولین کا چرکسی غلام اور معتمد

ہیب آقا اور عجیب غلام!

گذشتہ صدی کے اوائل میں روئے زمین پر ایک طوفانی آندھی آئی۔
ں نے بادشاہوں کے تخت الٹ دئے۔ تاجداروں کے تاج گرا دئے
ایک مہیب جبار تھا جس کے سامنے تمام یورپ سربسجود ہوگیا تھا۔
اس مہیب آقا کے ساتھ ایک عجیب و غریب غلام بھی دیکھا جاتا تھا
ہیب آقا نپولین تھا۔ اور عجیب الہیئت غلام رستم تھا!

رستم بن رضا کوفان ۱۷۸۲ء میں تفلیس (قوقاز) میں پیدا ہوا۔ اس کا
بچپن کوہ قاف کے مرغزاروں میں بسر ہوا تھا۔ لیکن زمانے کے انقلاب نے
س کے دل و دماغ پر اس سرزمین کے حسن و جمال طبیعت کا کوئی اثر باقی
نہیں چھوڑا۔ وہ نہ تو شاعر ہوا، نہ مصور۔ اس کی قسمت میں ایک عجیب
نسان کا عجیب غلام بننا تھا!!

نپولین کے سکرٹری مینول نے اپنے روزنامچے میں لکھا ہے :-

"رستم کا باپ طبیب تھا۔ بعض مؤرخین نے اُسے تاجر بھی بتایا ہے اُس کے چار اولاد تھی۔ ان میں ایک رستم تھا۔ ۱۷۹۵ء تک وہ اپنے والدین کے ساتھ رہا۔"

خود رستم نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے۔ کہ وہ اپنی ماں سے از حد محبّت رکھتا تھا۔ یہی محبت اُس کی تمام مصائب کا سبب ہوئی۔ باپ نے اُسے گھر سے نکال دیا۔ اور وہ آوارہ گردوں کی طرح گاؤں گاؤں پھرنے لگا۔ اتفاق سے اُسی زمانے میں وہاں کے اُمراء میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ رستم اس جنگ میں قید ہو گیا۔ اور بہت دنوں تک ایک قلعہ میں بند رہا۔ پھر وہاں سے بھاگا۔ تاکہ اپنی ماں کی کفالت کرے۔ اب وہ اپنے شوہر سے علیحدہ ہو گئی تھی۔ اور چھوٹے چھوٹے بچے ساتھ لے کر کسی طرف چلی گئی تھی۔ بہت تلاش کے بعد رستم نے ماں کا پتہ لگا لیا۔ اور اُس کے ساتھ رہنے لگا کچھ عرصہ کے بعد اُس نے ارادہ کیا۔ کہ کسی شہر میں جاکر آباد ہو جائے اور اپنے خاندان کی پرورش کا انتظام کرے۔ وہ سب کو ساتھ لے کر چل دیا مگر راستے میں بردہ فروش قزاقوں نے گھیر لیا۔ اور پورا قافلہ گرفتار ہو گیا۔ بردہ فروشوں سے ایک مالدار عورت نے رستم کو خرید لیا۔ اور اپنا لڑکا بنا کر گھر میں رکھا۔ لیکن اُس کے شوہر کو گھر میں اس خوبصورت نوجوان کی موجودگی ناگوار ہوئی۔ اُس نے مصر کے ایک امیر کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ مصری امیر رستم کو مصر لایا۔ پھر اپنے ساتھ مکۂ معظمہ لے گیا۔ حج

کے بعد دونوں شام کے راستے واپس ہوئے۔ مگر ابھی راہ ہی میں تھے۔ کہ معلوم ہوا، نپولین نے مصر پر قبضہ کر لیا ہے۔ امیر نے فیصلہ کیا۔ کہ مصر نہ جائے اور اپنے دوست احمد پاشا جزار والئی عکا کے یہاں قیام کرے۔ رستم نے لکھا ہے۔ کہ احمد پاشا نے اپنی دوستی کا حق اس طرح ادا کیا۔ کہ مصری امیر کو زہر دے کر مار ڈالا۔

نپولین تک رسائی

رستم نے اب اپنے سامنے ایک نئی مصیبت دیکھی۔ مجبوراً مصر بھاگ گیا۔ مصر میں ایک دوست نے اُسے مشہور خاندان بکری کے سجادہ نشین شیخ السادات کی خدمت میں پیش کر دیا۔ شیخ اُسے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اور اپنے غلاموں کا افسر بنا دیا۔

شام کے حملے سے واپسی پر نپولین کے استقبال کے لئے مصر کے تمام اُمراء شہر کے باہر کھڑے تھے۔ سید بکری بھی موجود تھے۔ وہ نپولین کی سواری کے لئے ایک گھوڑا شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا۔ چند دن بعد دو غلاموں کی فرمائش کی۔ سید بکری نے دو غلام حاضر کر دے۔ انہی غلاموں میں ایک رستم تھا۔ نپولین نے اپنی خدمت میں لیتے وقت رستم کو ایک مرصع تلوار اور طلائی دستے کے دو طپنچے عطا کئے۔

فرانس میں داخلہ

فرانس کی واپسی میں رستم بھی نپولین کے ساتھ تھا۔ راستے میں کوئی

خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ البتہ ایک دن نپولین کے ساتھیوں نے ستانے کے لئے کہہ دیا۔کہ :۔

"جنرل تمہیں اس لئے ساتھ لئے جاتا ہے، تاکہ پیرس کے جلسے میں تمہاری بھینٹ چڑھائے" سادہ لوح غلام ڈر گیا، اور داویلا مچانا شروع کر دیا۔ نپولین نے سُنا تو بہت ہنسا۔ اور وہ تمام رقم اُسے بخش دی، جو دورانِ سفر میں اپنے ساتھیوں سے جوئے میں جیتی تھی!

نپولین نے رستم کو مارسیلز میں چھوڑ دیا۔ ہر طرف لوگوں کی نظریں اُس پر پڑتی تھیں۔ عورتیں تو اس پر ٹوٹ پڑیں۔ اس کے عجیب مشرقی اطوار اور چہرہ کسی چشم و ابرو اُن کے لئے نئی قسم کی چیز تھی۔ چند دن بعد نپولین کا اسباب لے کر وہ پیرس روانہ ہوا۔ راستے میں ڈاکو مل گئے۔ اور تمام اسباب لوٹ لیا۔ رستم کی مرصع تلوار اور چھ ہزار فرنک کی تھیلی بھی چھین لی۔ جوزیفائن، نپولین کی بیوی، رستم کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ اور اپنی خدمت میں قبول کر لیا۔ بعد میں لوگوں نے اس طرح طرح کی چہ میگوئیاں کیں۔ کہا گیا۔ کہ جوزیفائن غلام پر عاشق ہے۔ اِسی قدر نہیں۔ بلکہ یہاں تک کہا گیا۔ کہ نپولین رستم کو محض اسی نیت سے لایا تھا۔ تاکہ جوزیفائن کے لئے دلچسپی کا سامان مہیا کر دے۔ اور خود اُس کی نگرانی اور رشک سے آزاد ہو جائے۔

رستم اور پیرس

کچھ ہی سبب ہو، لیکن پیرس میں رستم کے ظہور نے نپولین کی عظمت میں

غیر معمولی اضافہ کر دیا تھا۔ رستم اپنے بیش قیمت لباس میں "قنصل" (نپولین) کے ساتھ ساتھ پھرا کرتا تھا اور پیرس کی مخلوق اُسے دیکھ کر متحیر رہ جاتی تھی!"

قنصل مقرر ہونے کے بعد نپولین اُس محل میں اُٹھ گیا۔ جو حکومت نے اُسے دیا تھا۔ رات کو اُس کے خاص کمرے کی نگہبانی رستم ہی کے ذمے تھی وہ رات بھر دروازے پر پڑا رہتا تھا، اور کسی کو اندر جانے نہیں دیتا تھا"

ایک دن جوزیفائن کو معلوم ہوا۔ کہ نپولین کے ساتھ ایک عورت موجود ہے۔ وہ غصّے میں بھری ہوئی اُٹھی۔ اور کمرے میں گُھس پڑنا چاہا۔ مگر رستم دروازے پر سو رہا تھا۔ اُس کے خرّاٹے اتنے بلند اور خوفناک تھے۔ کہ جوزیفائن ڈر گئی۔ شمع ہاتھ سے گر پڑی۔ اور بدحواس اُلٹے پاؤں بھاگی!۔

دن کے وقت رستم کے فرائض یہ تھے۔ کہ صبح اپنے آقا کو حجامت میں مدد دیتا تھا۔ نپولین نہایت تنگ مزاج تھا۔ بار بار چلّا اُٹھتا تھا" گدھے آئینہ سیدھا کر۔ خوش قسمتی سے تیرا آقا مصری نہیں ہے۔ ورنہ گردن اڑا دیتا!" حجامت کے بعد اپنے آقا کو نہلاتا تھا۔ پھر اُس کے ساتھ دفتر جاتا تھا اور ایک لمحہ کے لئے بھی جدا نہیں ہوتا تھا۔"

کلیپر کہتا ہے:۔

"نپولین نے کبھی کسی سے محبّت نہیں۔ لیکن وہ اپنی فیاضی سے دوسروں کی محبت خرید لیا کرتا تھا۔ ہمیشہ جوئے میں اپنی تمام جیت، رستم کو دے دیا کرتا۔ ایک مرتبہ پانچ دن کے اندر تین ہزار فرنک رستم کو مل گئے۔ اِس تقرب کی وجہ سے تمام خادم رستم پر حسد کرنے لگے تھے۔ صرف خادم ہی نہیں

بہت سے بڑے بڑے آدمی بھی چلتے تھے۔ اُن کا خیال تھا۔ رستم کی یہ تمام قدر دانی صرف اسی لئے ہے۔ کہ وہ اُس کے دشمنوں کو خفیہ قتل کر ڈالتا ہے۔ رستم نپولین کے ساتھ سایہ کی طرح لگا رہتا تھا۔ حتیٰ کہ فوج کی قواعد کے وقت بھی آقا کے گھوڑے کے پہلو میں اُس کا عربی گھوڑا نمایاں نظر آتا تھا۔ گھوڑے پر چیتے کی کھال کا زین ہوتا تھا۔ زین پر سونے کا کام تھا۔ خود رستم کا لباس، ریشم کا کارچوبی ہوتا۔ دُور دُور تک اُس کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کر دیتی تھی۔ وہ اس قدر شاندار ہوتا تھا۔ کہ رستم، عرب بادشاہ معلوم ہوتا تھا۔ اور نپولین اُس کا فرنگی سپہ سالار۔ تھیٹر میں بھی وہ نپولین کے پہلو میں بیٹھتا تھا۔ تمام نظریں غلام کی شان و شوکت کے تماشہ میں محو ہو جاتی تھیں!"

جب کبھی وہ راستے میں تنہا ہوتا، مخلوق ہجوم کر کے ساتھ ہو جاتی۔ مسرت کے نعرے بلند ہونے لگتے۔ اپنے فاتح آقا کی طرح یہ غلام بھی اپنی عظمت و غرور میں مدہوش رہتا تھا۔ وہ بالکل پروا نہ کرتا تھا۔ کہ لوگ اُس کی تعریف میں نعرے لگا رہے ہیں، یا تضحیک کر رہے ہیں!

رستمی فیشن:

پیرس کی نازنینوں کے لئے رستم ایک متحرک فتنہ بن گیا تھا۔ وہ اُن کی نظر میں مشرقی حسن و جمال کا ایک پُر اسرار پیکر تھا۔ یہاں تک کہ اُس کے لباس کی بھی نقل اُتاری جانے لگی۔ پیرس کا سب سے زیادہ مقبول فیشن

رستمی فیشن" ہو گیا۔ خود جوزیفائن اس لباس پر فخر کرتی تھی۔ فرانس سے نکل کر یہ فیشن جرمنی پہنچا، اور لویزا ملکہ پروشیا تک نے اختیار کر لیا۔ عورتوں کی طرح مرد بھی اس کی تقلید کرنے لگے تھے۔ یہ بیماری ایسی عام ہوئی۔ کہ خود نپولین بھی مبتلا ہو گیا۔ اُس نے بھی رستم کا سا لباس اپنے لئے بنوایا تھا۔ اور بڑے بڑے جلسوں میں پہن کر جاتا تھا!

اُس عہد کے ماہر مصوروں نے رستم کی تصویریں اُتاریں۔ اخبارات و رسائل نے خاص اہتمام سے شائع کیں۔ پورے یورپ میں اس کی شہرت عام ہو گئی۔

جب نپولین کی تاجپوشی قریب آئی۔ تو اُس نے درباری درزی کو حکم دیا کہ رستم کے لئے بیش قیمت خلعت طیار کرے۔ یہ خلعت اس قدر گرانقدر تھا۔ کہ صرف کوٹ پر سات ہزار تین سو فرنک خرچ ہوئے تھے۔ جوتے کی قیمت ایک سو بیس فرنک تھی۔ یہ رقم اس زمانے میں ایک شاہی لباس ہی پر خرچ ہو سکتی تھی!

تاجپوشی کے جلوس میں رستم اپنے خاص لباس میں ملبوس شہنشاہ کے پہلو بہ پہلو چل رہا تھا۔ وہ خود بھی اپنے گھوڑے پر ایک شہنشاہ معلوم ہوتا تھا۔ ہر طرف اُس کے اعزاز میں تالیوں کا شور بلند تھا!

منتہائے عروج

رستم نے اپنی زندگی کے بہترین ایام شہنشاہ نپولین کے زیرسایہ

بسر کئے ۔ دربار میں اسے اتنا عروج حاصل تھا ۔ کہ خاص و عام سب حسد کرتے تھے ۔ نپولین جب کوئی شہر فتح کرتا تھا ۔ تو شاہی گاڑی میں فاتح کے پیچھے رستم ہی بیٹھتا تھا ۔ ناواقف اُسے سلطنت کا رکن اعظم خیال کرتے تھے ۔ بہت سے لوگ اُس کی خوشامدیں کرتے ، تاکہ اُس کے ذریعہ نپولین کی خوشنودی حاصل کرلیں !"

جب نپولین پیرس میں ہوتا ۔ تو رستم کو دو گھنٹے تفریح کی اجازت ملتی وہ اپنے اُن دوستوں سے ملنے جایا کرتا ۔ جن کے یہاں خوبصورت عورتیں ہوتیں ۔ لیکن میدانِ جنگ میں اُسے ایک لمحہ کی بھی فرصت نہیں ملتی تھی کیونکہ اُس کے فرائض ہر لمحہ اُسے شہنشاہ کے ساتھ رہنے پر مجبور کرتے تھے ۔ وہی اُس کے لئے کھانے کا بھی انتظام کرتا تھا ۔

نپولین کے کھانے کا کوئی وقت مقرر نہ تھا ۔ بسا اوقات وہ کھائے بغیر ہی سو جاتا ۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا ۔ کہ نپولین آدھی رات کو اپنے بستر پر گیا ۔ اور کھانا طلب نہ کیا ۔ رستم نے خیال کیا ۔ اب وہ کھانا نہیں کھائے گا ۔ اُس نے بھنی ہوئی مرغی خوشی خوشی کھانا شروع کر دی ۔ لیکن ابھی آدھی مرغی بھی کھانے نہیں پایا تھا ۔ کہ نپولین نے کھانا مانگا ۔ رستم بہت گھبرایا مگر اب کر ہی کیا سکتا تھا ، وہی بچی ہوئی مرغی لے کر حاضر ہوگیا ۔ نپولین دیر تک مرغی دیکھتا رہا ۔ پھر غلام پر غضبناک نظریں ڈالیں ۔ اور کہا " میں نہیں جانتا تھا ۔ کہ بعض مرغیوں کا صرف ایک ہی بازو اور ایک ہی ٹانگ ہوتی ہے ۔ مجھے کبھی اس بات کا وہم بھی نہیں گزرا تھا ۔ کہ دوسروں کا

جھوٹھا کھانا پڑے گا۔"

رستم ڈر گیا۔ رنگ فق ہو گیا۔ کانپتی ہوئی آواز میں کہنے لگا " مہربان آقا! مَیں بہت بھوکا تھا پہلے ارادہ صرف ران کھانے کا تھا مگر افسوس۔ باز و بھی مَیں نے کھالیا!" نپولین چپ ہو گیا، اور مرغی کھالی، صبح اُس نے ایک سپہ سالار کو بعض احکام دینے کے لئے طلب کیا۔ رستم بھی سامنے کھڑا تھا۔ نپولین نے سپہ سالار سے کہا " تم نے کچھ سُنا؟ کل رات مَیں نے آقا نے رستم کا پس ماندہ کھایا تھا! ملعون! اِدھر آ۔ مَیں تیرے کان ملونگا خبردار، پھر کبھی ایسی حرکت نہ کرنا!" یہ کہہ کر نپولین ہنس پڑا۔

شادی

رستم، اپنے آقا کو روز پیرس کی عورتوں سے اپنے عشقیہ معرکوں کی داستانیں سنایا کرتا تھا۔ نپولین کو ان واقعات سے بڑی دلچسپی ہوتی تھی۔ اور وہ غلام کی ہمت افزائی کیا کرتا تھا۔ آخر رستم کا یہ شوق رنگ لایا۔ اور وہ ایک عورت پر عاشق ہو گیا۔ اُس نے شہنشاہ سے شادی کی درخواست کی، نپولین نے پوچھا " وہ کچھ مالدار بھی ہے؟" رستم نے جواب دیا " جب تک حضور کے قدموں سے لگا ہوں، مجھے مال کی کیوں فکر ہو؟" نپولین کو یہ جواب پسند آیا۔ اور شادی کی اجازت دے دی۔

یکم فروری ۱۸۰۶ء میں الکزنڈرائن دوریل سے رستم کی شادی ہو گئی۔ خود شہنشاہ جلسہ میں شریک ہوا، اور تمام خرچ اپنی جیبِ خاص سے ادا

گیا۔ شادی کے ایک برس بعد لڑکا پیدا ہوا۔ رستم نے اس کا نام ایشیل رکھا۔ نپولین کو یہ بچہ بہت پیارا تھا۔ اکثر بلا کر اس سے کھیلا کرتا تھا۔ جب وہ لوٹتا تھا۔ تو اس کی دونوں مٹھیوں میں اشرفیاں ہوتی تھیں!

نپولین کو رستم اس قدر عزیز تھا۔ کہ سفر اٹلی کے موقعہ پر جب وہ بیمار ہوگیا۔ تو نپولین نے چلتے وقت اس سے کہا "رنج نہ کرنا۔ میں جلد واپس آؤنگا۔ میری بیوی تمہاری خبر لے گی"

خود رستم نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے۔ کہ شہنشاہ اس پر بے حد مہربان تھا۔ شروع میں نپولین نے اس کی کوئی تنخواہ مقرر نہیں کی تھی۔ ایک دن اتفاق سے یاد آگیا۔ تو فوراً ۱۲۰۰ فرنک مقرر کر دئے۔ تھوڑی ہی مدت بعد یہ رقم دوگنی کر دی گئی۔ یعنی ۲۴۰۰ فرنک ملنے لگے۔ نیز ۲۴۰۰ فرنک شکار میں بادشاہ کی بندوق اٹھانے کے لئے، اور ۹۰۰ فرنک دائمی انعام کے طور پر بھی ملتے تھے۔ اس کے علاوہ کھیل میں جس قدر روپیہ نپولین جیتتا تھا، سب اسے دے دیتا تھا۔ عیدوں اور جشنوں کے موقعہ پر بھی بہت کچھ دیتا تھا۔ چنانچہ ۲۰۰۰ فرنک ۱۸۰۸ء میں دئیے۔ ۳۰۰۰ فرنک ۱۸۱۰ء میں دئیے۔ ۴۰۰۰ ۱۸۱۱ء میں دئے۔ ۱۰۰۰ ۱۸۱۳ء میں دئے ۶۰۰۰ ۱۸۱۴ء میں دئے۔ پھر معزولی سے پہلے ایک مرتبہ یکمشت ۵۰۰۰۰ فرنک عطا کئے!

رستم کا خاتمہ:-

لیکن افسوس ہے۔ کہ مصیبت کے وقت رستم بے وفا ثابت ہوا۔

آقا کے تمام احسانات بھول کر اُس سے رُخ پھیر لیا!"

۶۔اپریل ۱۸۱۴ء میں نپولین کو تخت سے دست بردار ہونا پڑا تھا۔ وہ جب جزیرۂ البا کی طرف روانہ ہونے لگا، تو رستم، بلا اجازت اپنی بیوی سے مشورہ کرنے چلا گیا۔بیوی شریف تھی۔اُس نے کہا۔" تمہارا فرض ہے کہ اس نازک وقت میں اپنے مہربان آقا کا ساتھ نہ چھوڑو" نپولین کو اُمید نہیں تھی۔ کہ رستم لوٹے گا۔ مگر دوسرے دن دیکھا تو وہ موجود تھا۔اُس نے اپنے بلا اجازت چلے جانے پر افسوس وندامت کا اظہار کیا۔ اور نپولین کا دل اُس کی طرف سے صاف ہوگیا۔

اسی اثنا میں نپولین نے اپنی ناکامیوں سے مضطرب ہو کر زہر کھا لیا، مگر ڈاکٹروں نے اُس کی جان بچالی۔ ایک دن اُس نے رستم سے پستول طلب کیا۔رستم نے مارشل برتیہ سے مشورہ کیا۔ مارشل نے کہا۔ جو جی میں آئے کرو۔میں کوئی مشورہ نہیں دونگا لیکن بعض دوستوں نے کہا۔اگر شہنشاہ خودکشی کرلے گا۔تو دُنیا تمہیں کو الزام دے گی۔کہا جائیگا تم نے دشمنوں سے رشوت لے کر پستول نپولین کے حوالہ کر دیا۔تاکہ وہ خودکشی کر لے۔

اس واقعہ کو رستم نے حیلہ بنایا، اور نپولین سے ہمیشہ کے لئے علیحدہ ہوگیا۔جلا وطن ہوتے وقت شہنشاہ نے اپنے غلام کی بابت سوال کیا اور جب اُس کی بے وفائی کا حال سنا۔تو قدرتی طور پر بہت رنجیدہ ہوتا۔

رستم کی بے وفائی اسی پر ختم نہیں ہوگئی، بلکہ وہ دو مرتبہ انگلستان بھی گیا۔ وہاں نپولین کے دشمنوں کے سامنے اپنا شاہی خلعت پہنکر جایا کرتا تھا انگریزوں کے ہاتھ اُس نے اپنے آقا کی بہت سی یادگاریں بھی بیچ ڈالیں انمیں سونے کا ایک ٹکڑا بھی تھا۔ اس پر لکھا تھا۔ نپولین کی یادگار اپنے وفادار غلام رستم کے لیئے۔"

۷ستمبر ۱۸۴۵ء کو اُس کا انتقال ہوا۔ اُس کی قبر اب تک پیرس میں موجود ہے۔ اور اُس پر یہ عبارت کندہ ہے:۔

"یہاں شہنشاہ نپولین کا غلام رستم رضا سو رہا ہے"

اُس کی زندگی ہی میں اُس کے دونوں لڑکے مر چکے تھے۔ صرف بیوہ اور ایک لڑکی باقی رہی۔ لڑکی کی شادی ایک فرانسیسی تاجر سے ہو گئی تھی

سید جمال الدین اسد آبادی معلی

تقریباً دو ماہ[1] گزرے ہیں۔ کہ ایک شخص سید جمال الدین نامی سے میری ملاقات ہوئی۔ اس شخص کی شخصیت کا میرے دماغ پر جو اثر پڑا، وہ ایسا ہے۔ جو بہت کم شخصیتیں مجھ پر ڈال سکی ہیں۔ یہ اثر بہت قوی اور گہرا تھا اور اسی کا نتیجہ ہے۔ کہ مجھے خیال ہوا، سوربون یونیورسٹی کے خطبات کا موضوع یہ قرار دوں۔ کہ "اسلام اور اس کا علم سے علاقہ" سید جمال الدین کی ذہنیت ایک ایسی ذہنیت ہے۔ جو رسمی اسلام کے موثرات کی پوری طرح مقاومت کر سکتی ہے۔ میں جب اس شخص سے باتیں کر رہا تھا، تو اس کے افکار کی آزادی، طبیعت کی فضیلت، اور اظہار حقیقت کی جرأت دیکھ کر مجھے خیال ہوا۔ میں اس وقت ان مشاہیر عالم میں سے کسی ایک کو مخاطب کر رہا ہوں۔ کہ دنیا کے گزشتہ علمی زمانوں میں گزر چکے ہیں۔ اور جن سے تاریخ کے ذریعہ ہم نے واقفیت حاصل کی ہے۔ میں گویا ابن سینا، ابن رشد، یا ان حکماء عظام میں سے کسی حکیم کو اپنے سامنے دیکھ رہا تھا۔ جنہوں نے فکر انسانی کو جہل و اوہام کے قیود سے

---

[1] یہ ملاقات مولینا ابوالکلام آزاد سے ۲۶ اگست ۱۹۳۲ء کے دو ماہ قبل ہوئی۔

نجات دلانے کے لئے تاریخِ عالم کی پانچ صدیوں تک اپنی شجاعانہ جدوجہد جاری رکھی تھی!

سیّد جمال الدین

انیسویں صدی کی تاریخ مشرق نے اصلاح و تجدد کی جس قدر شخصیتیں پیدا کی ہیں، اُن میں کوئی شخصیت بھی وقت کی عام پیداوار سے اس قدر مختلف اور اپنی طبعی ذہانت اور غیر اکتسابی قوتوں میں غیر معمولی نہیں ہے، جس قدر سید جمال الدین کی شخصیت ہے۔ بغیر کسی تامل کے کہا جا سکتا ہے کہ مشرقِ جدید کے رجالِ تاریخ اور قائدین فکر کی صف میں اُس کی شخصیت کئی اعتبار سے اپنا سہیم و شریک نہیں رکھتی!۔

وہ ایک گمنام اور مجہول ماحول میں پیدا ہوا۔ ایسے مجہول ماحول میں کہ آجتک یہ بات قطعی طور پر معلوم نہ ہو سکی۔ کہ وہ فی الحقیقت باشندہ کہاں کا تھا؟ اسد آباد کا جو ہرات کے قریب اور افغانستان میں واقع ہے، یا اسد آباد کا جو ہمدان کے قریب اور ایران میں واقع ہے؟

اُس کے وطن کی طرح اُس کی ابتدائی زندگی کے حالات پر بھی ظن و تخمین کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ تاہم یہ قطعی ہے۔ کہ تعلیم و تربیت کا اسے کوئی موقعہ ایسا نہیں ملا تھا۔ جو کسی اعتبار سے بھی ممتاز اور قابلِ ذکر ہو۔ انیسویں صدی کے کامل تنزل یافتہ افغانستان اور پنجاب کے علماء اپنے گھروں اور مسجدوں میں علوم رسمیہ کی جیسی کچھ تعلیم دیا کرتے تھے، زیادہ سے زیادہ تعلیم جو اُس نے

حاصل کی تھی، وہ وہی تھی۔ جن اُستادوں سے اُس نے تعلیم حاصل کی، وہ بھی یقیناً معمولی درجہ کے تھے۔ اُن میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جس کی علمی شخصیت قابلِ ذکر ہو۔

دُنیا کے نئے تمدنی انقلاب اور نئے علوم سے آشنا ہونے کا بھی اُسے کوئی خاص موقع حاصل نہیں ہوا تھا۔ اُس کا ابتدائی زمانہ زیادہ تر افغانستان میں بسر ہوا، یا ایک روایت کے مطابق ایران میں، اور یہ دونوں مقامات اُس وقت مغربی تمدن و علوم کی تعلیم و تعلم کا کوئی سامان نہیں رکھتے تھے۔ صحبت اور معاشرت بھی اکتسابی تعلیم و تربیت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، بلکہ بسا اوقات درس و تدریس کی باقاعدہ تعلیم سے بھی کہیں زیادہ موثر ہوتی ہے۔ لیکن جہاں تک اس کی زندگی کے حالات روشنی میں آئے ہیں، کوئی قرینہ اس کا موجود نہیں۔ کہ اُسے مشرق و ایشیا کی عام مقلدانہ و رسمی سطح سے کوئی بلند درجہ کی صحبت ملی ہو۔

سیر و سیاحت بھی ذہن کی نشو و ترقی کا بہت بڑا ذریعہ ہے، لیکن اُس نے اپنی ابتدائی زندگی میں ہندوستان اور حجاز کے سوا اور کسی مقام کا سفر نہیں کیا تھا۔ ظاہر ہے۔ کہ ان دونوں مقامات میں کوئی سرچشمہ ایسا موجود نہ تھا جس سے ایک مجتہدانہ فکر و نظر کی پیدائش ہو سکے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں ان مقامات کا تعلیمی تنزل منتہائے کمال تک پہنچ چکا تھا۔

✓ سب سے زیادہ یہ کہ اُس نے جتنی بھی اور جیسی کچھ بھی تعلیم حاصل کی تھی، وہ وہی تعلیم تھی جو بجائے خود مسلمانوں کے ذہنی تنزل کی پیداوار

ہے، اور گئی صدیوں سے اسلامی دُنیا کے دماغی تنزل کا سب سے بڑا سبب بن گئی ہے۔ اِس تعلیم سے ذہن و فکر کی تمام قوتیں پژمردہ ہو جاسکتی ہیں لیکن آزادانہ نشو و نما نہیں پاسکتیں۔

بااین ہمہ وہ ۱۸۷۱ء میں جب کہ اُس کی عمر بمشکل تیس برس کی ہوگی یکایک قاہرہ میں نمایاں ہوتا ہے! اور صرف چالیس دن کے قیام سے اس عظیم مشرقی دارالحکومت کے تمام علمی حلقوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ حتیٰ کہ اُس کی عجیب اور نئی قسم کی علمی قابلیتوں کی شہرت دارالخلافہ قسطنطنیہ تک پہنچتی ہے، اور اس کی تمام اصلاحی اور انقلابی قوتیں نمایاں ہو جاتی ہیں!

وہ ادب عربی کا ایک عجمی متعلم تھا جس نے بعید ترین عجمی ممالک میں عجمی اساتذہ سے ناقص اور گمراہ قسم کی ادبی تعلیم حاصل کی تھی۔ لیکن وہ عربی زبان کے سب سے بڑے مرکز، قاہرہ میں سب سے پہلے صحیح و صالح فن عربیہ کا درس دیتا ہے۔ اور عربی کتابت و تحریر کا ایک نیا دور پیدا کر دیتا ہے۔ آج مصر و شام کے تمام مشاہیر اہل قلم اعتراف کرتے ہیں کہ "کتابت عربیہ میں ہم سب اسی عجمی کے عیال ہیں" موجودہ عہد میں عربی کا سب سے بہتر کاتب، شیخ محمد عبدہ تھا۔ اور وہ اسی کا شاگرد تھا!۔

اس نے علوم حکمیہ کی جس قدر بھی تعلیم حاصل کی تھی، وہ وہی موجودہ مدارس عربیہ کے متون و شروح کی عقیم و کج اندیش تعلیم تھی۔ لیکن وہ ذہین و مستعد طلباء کی ایک جماعت منتخب کر کے علوم حکمیہ کا درس و املاء شروع کر دیتا ہے، اور قدیم معقولات کی وہ تمام گرہیں ایک ایک کر کے واضح کرتا

ہے۔ جنکے اعتقاد و جمود نے صدیوں سے مشرقی دنیا کا ذہنی ارتقا معطل کر دیا ہے۔

مذہب اور علم، دونوں میں اُس کی مصلحانہ ذہنیت نمایاں ہوتی ہے۔ اور کسی گوشہ میں بھی اُس کے قدم وقت کی مقلدانہ سطح سے مس نہیں ہوتے۔ سیاست میں وہ سرتاپا انقلاب کی دعوت ہوتا ہے، اور جہاں کہیں جاتا ہے چند دنوں کے اندر مستعد اور صالح طبیعتیں چن کر انقلاب و تجدد کی روح پھونک دیتا ہے۔ اُس نے بیک وقت مصر، ایران اور عراق، تینوں مقامات میں اصلاح و انقلاب کی تخم ریزی کر دی!

وہ اپنے اولین قیام مصر سے تقریباً بارہ برس بعد پہلی مرتبہ یورپ کا سفر کرتا ہے، اور پیرس میں وقت کے سب سے بڑے فلسفی اور علم و دین کی تمام نہاد نزاع میں سب سے بڑے حریف دین و مذہب، پروفیسر رینان سے ملتا ہے وہ پہلی ہی ملاقات میں اس "عجیب الاطوار مشرقی فیلسوف" سے اس درجہ متاثر ہوتا ہے۔ کہ اخبار طان میں سید موصوف کے ایک مقالہ کا وہ ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"میں نے اس کے شخصیت میں ابن سینا اور ابن رشد کی روح دیکھی" جیساکہ اوپر ذکر ہوچکا ہے۔ یاد رہے کہ انسان کی قابلیت کیسی ہی کیوں نہ ہو لیکن مخاطب کے تاثر کے لئے وہ بہت کچھ قوت بیانیہ اور فصاحت تکلم کا محتاج ہوتا ہے۔ جس وقت سید جمال الدین رینال سے پیرس میں اور لارڈ سالسبری سے لنڈن میں ملا ہے۔ اُس وقت اس کی فرانسیسی زبان کی

تعلیم کی تاریخ صرف اتنی تھی۔ کہ اثنائے قیام مصر میں ایک شخص سے لاطینی الف بے قلمی لکھوا لی تھی، اور پھر کچھ عرصہ کے بعد ایک کتاب خرید لی تھی۔ جو عربی میں فرانسیسی کی ابتدائی تعلیم کے لئے لکھی گئی تھی۔ کوئی ثبوت موجود نہیں۔ کہ اُس نے کسی انسان سے باقاعدہ فرانسیسی زبان کی تعلیم حاصل کی ہو، لیکن یہ واقعہ ہے۔ کہ وہ فرانسیسی زبان میں بہتر سے بہتر تحریر و تقریر کر سکتا تھا۔ ترکی، روسی اور انگریزی بھی اسی طرح اُس نے سیکھ لی تھی۔

مشہور ہے۔ کہ جب پیرس میں روسی سفیر نے اُس سے ملنا چاہا۔ تو اُس نے ملاقات کی تاریخ ایسی مقرر کرائی۔ جو دو ہفتہ بعد آنے والی تھی۔ اُس کے بعد وہ ایک کتب فروش کے یہاں گیا۔ اور اُس سے کہا "مجھے فرانسیسی میں روسی زبان سکھلانے والی کتاب چاہیئے۔ میں خرید لوں گا۔ بشرطیکہ تم اس کا بھی انتظام کر دو۔ کہ کہ آج سے ایک ہفتہ بعد کوئی روسی زبان بولنے والا آدمی مجھ سے ملاقات کر سکے۔" کتب فروش نے کتاب بھی دی، اور ایک ایسے شخص کا انتظام بھی کر دیا۔ جو اُسی کے یہاں ملازم تھا۔ جمال الدین نے ایک ہفتہ تک بطور خود کتاب دیکھی، پھر آٹھویں دن سے چودھویں دن تک روز ایک گھنٹہ روسی سے باتیں کرتا رہا۔ اور پندرھویں دن وہ تیار ہو گیا تھا۔ کہ روسی سفیر سے بغیر کسی مترجم کی وساطت کے ملاقات کرے!

سید کے سوانح حیات

اگر سید جمال الدین کی زندگی میں لوگ اُس کے حالات سے واقف نہ ہو سکے۔ تو یہ چنداں عجیب بات نہیں ہے۔ دنیا نے ہمیشہ اپنے اکابر و اعاظم سے ان کی زندگی میں غفلت برتی ہے، اور جب تک وہ دُنیا سے رخصت نہیں ہو گئے ہیں، اُن کے حقوق کا اعتراف نہیں کیا ہے۔ خصوصاً مصلحین و مجدد دین اُمم کے لئے تو زندگی میں تغافل اور موت کے بعد تعظیم و احترام، اس دُنیا کا ایک عام اور غیر متغیر قانون ہے۔ لیکن یہ صورتِ حال کس درجہ عجیب اور تاسف انگیز ہے۔ کہ اس کی وفات پر پورے تیس برس گزر چکے ہیں، اور وہ تمام مشرقی ممالک بیدار ہو چکے ہیں۔ جہاں اُس نے اصلاح و انقلاب کی ابتدائی تخم ریزی کی تھی، تاہم اُس کی زندگی بدستور تاریخ کی روشنی سے محروم ہے۔ اور اُس سے زیادہ مشرق کچھ نہیں جانتا، جتنا یورپ کے بعض محب مشرق اہلِ قلم نے بتلا دیا ہے!

افسوس اس جہل و غفلت پر! ہم صرف اپنے قدماء کی شناخت ہی کے لئے یورپ کے محتاج نہیں ہیں۔ بلکہ اپنے عہد کے اہلِ فضل و کمال کے لئے بھی اس کے محتاج ہیں۔ جب تک وہ انگلی سے اشارہ کر کے نہ بتلا دے، تو ہم خود اپنی قوم اور عہد کے بڑے بڑے انسانوں

کو بھی نہیں پہچان سکتے!

ہندوستان میں تو الہلال کی اشاعت سے پہلے، غالباً لوگ سید جمال الدین کے نام سے بھی آشنا نہ تھے۔ ۱۸۷۹ء میں جب وہ حیدرآباد اور کلکتہ میں مقیم تھا، تو ہندوستانی مسلمانوں میں سے صرف ایک شخص یعنی مرحوم عبدالغفور شہباز تھا، جسے اس کے فضل و کمال کی تھوڑی سی شناخت نصیب ہوئی تھی، اور اس کے چند فارسی مقالات کا اردو ترجمہ شائع کیا تھا!"

سعد باشا زغلول

مختصر سوانح حیات

سعد باشا کا سنِ ولادت ۱۸۶۰ء ہے۔ ان کی طفولیت کے زمانے میں نئی تعلیم کے مدارس نے اس درجہ فروغ نہیں پایا تھا کہ لوگوں کو ان کی طرف توجہ ہوتی۔ اُن سب کے لئے جو تعلیم کا شوق رکھتے ہوں، صرف ایک ہی جگہ تھی، اور وہ جامع ازھر کی درسگاہ تھی۔ چنانچہ علوم عربیہ و اسلامیہ کی متوسط درجہ تک تعلیم انہوں نے اور اُن کے چھوٹے بھائی فتحی بے نے جامع ازھر ہی میں حاصل کی۔

اِن کی عمر ابھی بیس برس کی بھی نہیں ہوئی تھی۔ کہ قاہرہ میں سید سید جمال الدین کی علمی مجالس کی شہرت پھیلی۔ یہ سید موصوف کا مصر میں دوسرا دورہ تھا، اور شیخ محمد عبدہ ان کے نہایت سرگرم شاگرد ہو چکے تھے سعد زغلول بھی ان کی مجالسِ درس میں پہنچنے لگے اور شیخ محمد عبدہ سے اُن کا رشتۂ ارادت و تلمذ قائم ہو گیا۔ اِسی رشتہ نے ان کی اُس تعلیمی ذہنیت میں جو جامع ازھر کے تعلیمی جمود سے پیدا ہوئی تھی۔ ایک انقلابی حالت

پیدا کر دی، اور نظر و فکر کی نئی نئی راہیں کھلنے لگیں۔ اُن کی وہ غیر معمولی قوتِ خطابت و فصاحت جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ اپنے معاصرین میں ممتاز رہے۔ دراصل شیخ محمد عبدہ ہی کی صحبت و تلمذ کا نتیجہ تھی۔

عربی پاشا کی فوجی تحرک جو بہت حد تک سید جمال الدین کی سیاسی تخم ریزیوں کا قبل از وقت نتیجہ تھی۔ جب ۱۸۸۲ء میں نمودار ہوئی، تو شیخ محمد عبدہ حکومتِ مصر کے سرکاری گزٹ "الوقائع المصریہ" کے محرر اور مطبوعاتِ مصریہ کے مدیر تھے، اور غالباً سعد زغلول بھی ان کے ساتھ اسی دفتر میں کام کرتے تھے۔ چند ماہ بعد جب خدیو توفیق پاشا کی وطن فروشی اور سلطان عبدالحمید کی مذبذب اور متزلزل حکمتِ عملی کی کمزوری سے "تل الکبیر" کے معرکہ کے بعد انگریزی فوج مصر میں داخل ہوگئی، تو عربی پاشا اور محمود بارودی پر مقدمہ چلایا گیا، اور شیخ محمد عبدہ بھی ان کے ساتھ گرفتار کر لئے گئے۔ اِن کا جرم یہ بتلایا گیا تھا کہ انہوں نے وقائع مصریہ میں ایسے مقالات لکھے تھے۔ جن میں تحریک کی حمایت کی گئی تھی۔ غالباً سعد زغلول بھی اُن کے تعلق کی وجہ سے مبتلائے محن ہوئے۔ لیکن بعد کو رہا کر دئے گئے۔ کیونکہ فی الحقیقت شیخ کے تعلق و تلمذ کے سوا اِن کا تحرک میں کوئی حصہ نہ تھا۔

اسی زمانہ میں انہیں نئی تعلیم کا شوق ہوا۔ پہلے فرانسیسی زبان کی تحصیل کی۔ پھر قانون کا مطالعہ کیا۔ اور ۱۸۸۹ء میں وکالت شروع کر دی۔ اُن کی غیر معمولی ذہانت اور طبعی استعداد کے ثبوت میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے۔

کہ جب انہوں نے مصر کی اعلیٰ عدالتوں میں وکالت کرنی چاہی، تو سرکاری محکمہ نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ نہ تو انہوں نے باقاعدہ سرکاری مدارس میں تعلیم حاصل کی تھی، نہ یورپ کے مدارس قانون کی کوئی سند رکھتے تھے۔ لیکن انہوں نے اپنے استحقاق و اہلیت پر اصرار کیا، اور کہا "اگر اس معاملہ کا دار و مدار استعداد اور اہلیت پر ہے۔ نہ کہ سند کے ایک پرزہ پر، تو قانون کا سخت سے سخت امتحان لے لیا جائے۔ اگر میں یورپ کے سند یافتہ محامیوں سے (مصر میں قانون کے بیرسٹر کو محامی کہتے ہیں) بہتر ثابت ہوں۔ تو میری درخواست منظور کی جائے۔" یہ واقعہ ہے کہ امتحان لیا گیا، اور یہ اُن کی قانونی استعداد بہتر سے بہتر معیار پر بھی پوری اُتری!

ان کی غیر معمولی استعداد نے بہت جلد ترقی مناصب کی راہ اُن پر کھول دی۔ پہلے بعض قانونی مناصب پر مامور ہوئے۔ پھر ۱۹۰۶ء میں اس درجہ شہرت حاصل کر لی کہ وزیر تعلیم ہو گئے۔

اسی زمانہ میں مصری مجلس تشریع (لیجسلیٹو اسمبلی) کے نظام میں وسعت ہوئی۔ اور نئے نئے طریقے رائج ہوئے۔ یہ ہر موقعہ پر سرکاری مناصب کے لیئے ایک اول درجہ کے امیدوار تسلیم کئے جاتے تھے۔ ۱۹۱۱ء میں مجلس تشریع نے انہیں اپنا رئیس منتخب کیا۔ جس پر وہ (غالباً) ۱۹۱۴ء تک قائم رہے

سعد زغلول کا سیاسی مسلک

سعد زغلول کی تعلیمی اور سیاسی، دونوں زندگیوں کی ابتداء شیخ محمد عبدہ

کی تعلیم و تاثیر سے ہوئی تھی، اس لئے وہ اپنی زندگی کے آخری سالوں تک یعنی ۱۹۱۸ء تک جبکہ التوار جنگ کے بعد انہوں نے مصر کے کامل استقلال کا مطالبہ کیا ہے) اسی مسلک پر گامزن رہے۔ جو واقعہ عرابی کے بعد خود شیخ محمد عبدہ نے اختیار کر لیا تھا۔ ہمیشہ اُن کا شمار شیخ کی جماعت کے مخصوص افراد میں رہا۔ وہ اُن تمام لوگوں میں جنہیں شیخ کی فیضِ صحبت نے پیدا کیا تھا نمایاں اور ممتاز تھے۔

شیخ محمد عبدہ مرحوم کا یہ حال تھا۔ کہ وہ فطرت کی بہترین دماغی بخششیں لے کر پیدا ہوتے، لیکن جامع ازہر کی تعلیمی فضا سے کوئی بلند تر تعلیمی فضا حاصل نہ کر سکے۔ اسی اثنا میں سید جمال الدین مرحوم قاہرہ پہنچے، اور اُن کے فیضِ صحبت سے شیخ کے تمام فطری جوہر اُبھر آئے۔

سید موصوف کی دعوت اگرچہ تعلیمی اور دینی اصلاح پر مشتمل تھی۔ لیکن اس کا محوری مرکز سیاسی انقلاب تھا۔ کیونکہ وہ یقین کرتے تھے۔ کہ اسلام کی دینی روح، سیاسی رُوح سے الگ نہیں ہے۔ انہوں نے مصر میں بھی انقلابی دعوت کی تخم ریزی کی۔ اُس وقت مصر اسماعیل پاشا کی مسرفانہ عیش پرستانہ زندگی سے تباہ ہو رہا تھا۔ اغیار و اجانب کی مداخلتوں کے نئے نئے دروازے کھل رہے تھے، طالبین اصلاح کی تمام اُمیدیں ولیعہد مصر توفیق پاشا سے وابستہ تھیں۔ سید جمال الدین نے توفیق تک رسائی حاصل کرنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا۔ کہ پہلے خود قاہرہ کے فری میسن لاج میں داخل ہوئے، پھر کوشش کر کے توفیق کو بھی اس کا

گرینڈ ماسٹر منتخب کرالیا، اور اس طرح فری میسن کا مخفی اور محفوظ جماعتی دائرہ اپنے اور اُس کے گرد کھینچ لیا۔ توفیق پاشا سید موصوف کے اصلاحی خیالات سے پوری طرح متاثر ہوا۔ اور عہد واثق کیا۔ کہ با اقتدار ہوتے ہی اصلاح و انقلاب حال کے لئے پوری طرح کوشش کریگا۔ لیکن جب کچھ عرصہ کے بعد وہ خدیو مصر ہوا، اور سید جمال الدین اُن عہود و مواثیق کے ایفا کے طالب ہوئے، تو پہلے تو لیت و لعل شروع کیا۔ پھر صاف انکار کر دیا۔ اور کوشش کی۔ کہ جمال الدین مصر سے نکل جائیں۔

سید جمال الدین یہ حالت دیکھ کر نہایت متاثر ہوئے۔ اُن کا عقیدہ یہ تھا۔ کہ افراد قوم اور ملک کی نجات کی راہ میں حائل ہوں اُنہیں راہ سے ہٹا دینا جرم نہیں ہے۔ بلکہ انسانیت کی خدمت ہے۔ چنانچہ انہوں نے توفیق پاشا کے قتل کی کوششیں شروع کر دیں۔ اور اس کام کے لئے قرعۂ فال اُن کے نوجوان تلمیذ محمد عبدہ کے نام نکلا۔ شیخ نے اس واقعہ کے بیس برس بعد ایک خط میں جو مسٹر بلنٹ کے نام لکھا تھا، اقرار کیا ہے۔ کہ توفیق کو قتل کر دینے کے لئے وہ تیار ہو گئے تھے۔ توفیق پاشا قاہرہ سے اسکندریہ جا رہا تھا؛ یہ پستول لے کر سڑک پر کھڑے ہو گئے مگر جب حملہ کا وقت آیا۔ تو انہوں نے محسوس کیا۔ کہ یہ کام اس قدر آسان نہیں ہے جس قدر انہوں نے ذمہ داری لیتے ہوئے خیال کیا تھا ان کا دل مضطرب ہو کر رہ گیا۔ اور حملہ نہ کر سکے۔

اس کے بعد جمال الدین مصر سے نکل جانے پر مجبور ہوئے۔ اور

ہندوستان چلے آئے۔

عرابی پاشا کے حادثہ میں شیخ محمد عبدہ کو بھی جلا وطنی کی سزا دی گئی تھی، لیکن چھ سات کے بعد جب انہوں نے مصر آنا چاہا۔ تو حکومت نے اجازت دے دی، اور واپسی کے تھوڑے ہی عرصہ بعد افتار کے عہدہ پر مامور ہوئے۔ اسی عہد سے مصر میں ان کی دینی و تعلیمی اصلاحات کا اصلی دور شروع ہوتا ہے۔

لیکن ابتدائی سیاسی زندگی کی ناکامیوں کا جو ردِ فعل اُن کے اندر پیدا ہو گیا تھا؛ ضروری تھا۔ کہ اس کے اثرات ان کے فکری مزاج میں بھی سرایت کر جاتے۔ چنانچہ وہ مدت العمر کے لئے سیاست سے یک قلم علیحدہ ہو گئے۔ اِس سے بھی زیادہ یہ کہ مصر میں انگریزی قبضہ کے فوائد کا اعتراف کر لیا، اور پوری زندگی تام نہاد اعتدال سے بھی زیادہ محتاط سیاسی عقائد میں بسر کر دی۔ انہوں نے اپنے مشہور مقالہ "الاسلام و النصرانیۃ" میں سیاست سے اور اُن تمام باتوں سے جو سیاست سے ادنیٰ تعلق بھی رکھتی ہوں، حتیٰ کہ سیاست کے لغوی مادہ سے بھی؛ جو "تعوذ" کیا ہے وہ اُن کی فکری حالت کا مظہر ہے۔

انہوں نے متعدد مرتبہ اپنے اس مسلک کی تشریح بھی کی تھی۔ اُن کا خیال یہ تھا۔ کہ انگریزی قبضہ کی وجہ سے اگرچہ مصر کے سیاسی استقلال کو نقصان پہنچا ہے؛ لیکن ساتھ ہی تحریر و تقریر کی آزادی اور تعلیمی و اقتصادی ترقی کے فوائد بھی حاصل ہوئے ہیں۔ ملک کا فرض ہے کہ پہلے اس مہلت سے

فائدہ اُٹھا کر اپنی تعلیمی اور دینی حالت درست کرلے۔ پھر سیاسی استقلال کے لئے ساعی ہو۔ اُن کا جو سیاسی لائحہ مسٹر بلنٹ نے " مصر کی مخفی تاریخ " میں شائع کیا ہے، وہ تعجب انگیز حد تک ان کی سیاسی قناعت پسندی ظاہر کرتا ہے۔ ۱۹۰۱ء میں ان کا خیال تھا کہ مصر کے لئے بڑی سے بڑی چیز جو ہو سکتی ہے۔ وہ صرف یہ ہے۔ کہ ایک اچھی قسم کی مجلس تشریع (لیجسلیٹو اسمبلی) اُسے دے دی جائے۔ جس کی ایک بڑی تعداد کے انتخاب کا حق ملک کو حاصل ہو۔ وہ اس لائحہ میں انگریزی قبضہ کے خلاف ایک لفظ نہیں کہتے۔

بہر حال شیخ محمد عبدہ کا سیاسی مسلک اس نوعیت کا تھا۔ اور چونکہ سعد زغلول بھی انہی کے تلمیذ اور صحبت یافتہ تھے۔ اس لئے سیاسی عقاید میں اس سطح سے بلند نہ ہو سکے۔ ۱۹۱۸ء تک اُن کی تمام زندگی سرکاری مناصب میں گزری۔ اور آزاد قومی تحریکات کے خلاف وہ ویسے ہی ایک سرگرم سرکاری عہدہ دار رہے۔ جیسے مصر کے دفتری اقتدار کے تمام دیگر افراد تھے۔ ۱۸۹۶ء میں جب مرحوم مصطفیٰ کامل پاشا نے حزب الوطنی کی بنیاد ڈالی تو یہ بھی اس کے ویسے ہی مخالف تھے۔ جیسے مصر کے سرکاری حلقہ کے تمام افراد (بہ استثنا خدیو عباس، کیونکہ وہ مخفی طور پر مصطفیٰ کامل کا سرپرست تھا) مخالف تھے۔ ۱۹۰۵ء میں جب سید علی یوسف مالک المویہ نے " حزب الامۃ " قائم کی۔ اس کے اندر بھی سعد زغلول اور اُن کے ساتھیوں ہی کا ہاتھ کام کر رہا تھا۔ مقصود یہ تھا کہ حزب الوطنی کو شکست ہو۔ مصطفیٰ کامل پاشا

نے جب انتقال کیا۔ اور ان کی جگہ مرحوم فرید بے حزب الوطنی کے رئیس منتخب ہوئے، تو جن لوگوں نے اُن کی مساعی کی تخریب میں سرکاری وسائل سے کام لیا۔ اُن میں ایک سرگرم اور طاقتور شخصیت سعد پاشا کی بھی تھی۔ شیخ عبدالعزیز شاویش نے جب اللوا کی جگہ حزب الوطنی کے لیے "العلم" جاری کیا، تو جس شخص نے سب سے زیادہ اپنے وسائل کار ان کی مخالفت میں خرچ کئے حتیٰ کہ ان کی گرفتاری کے احکام بھی صادر ہو گئے۔ وہ سعد پاشا زغلول ہی تھے!

اس سلسلہ میں ۱۸۹۵ء سے لے کر ۱۹۱۸ء تک جو واقعات پیش آئے وہ بے شمار ہیں، اور ایک مقالہ میں اُن کا استقصاء ممکن نہیں۔ مصر کی سیاسی حالت نے ایک ایسی نوعیت پیدا کر لی تھی۔ کہ اس میں دو مذہبوں کے سوا عملاً تیسرے مذہب کی گنجائش ہی نہ تھی۔ یا تو انگریزی قبضۂ مصر سے مصر کو فوراً نجات ملنی چاہیئے؛ یا اسے جاری رکھنا چاہیئے۔ یہی دو اصولی اعتقاد "حزب الوطنی" اور "حزب الاحتلال" کی شکل میں ظاہر ہوئے۔ حزب الاحتلال کے داعی یعقوب صروف اور فارس نمر کامل مرحوم کی زبان سے بلند ہوتی تھیں۔ چونکہ قبضۂ مصر کی صریح موافقت مصری طبائع پر بالطبع گراں گزرتی تھی، اس لئے ارباب مناصب و موالات اپنے آپ کو حزب الاحتلال میں ظاہر کرنے سے جھجکتے تھے، اور اس قسم کی پردہ پوش توجیہ کرنے لگتے تھے۔ جیسی ہمیشہ ان حالات میں ضعفاءِ ہمت اور بیچارگانِ عزم نے کی ہیں۔ مثلاً "تدریجی اصلاحات" کا مغالطہ، "مصالح وقت" کا حیلہ، "تعلیمی استعداد کی تقدیم" کا فریب خیال، اور اسی طرح کے حیل و مغالطات، لیکن حقیقت حال یہ

ہے۔ کہ ان تمام لوگوں کی ذہنیت حزب الاحتلال ہی کی ذہنیت تھی، کیونکہ بیرونی قبضہ کی موجودگی میں صرف دو ہی سیاسی عقیدے کسی ملک کے لئے ہوسکتے ہیں۔ یا تو قبضہ رہنا چاہیئے۔ یا اُسے فوراً ختم ہو جانا چاہیئے۔ اِن دونوں کے درمیان تیسری راہ ممکن نہیں! ویریدون ان یتخذوا بین ذلک سبیلا

۱۹۱۸ء میں انقلاب فکر

بہر حال سعد پاشا کی پوری زندگی جس عالم میں بسر ہوئی تھی۔ اُس سے قومی و وطنی جہاد استقلال کا عالم متصل نہ تھا۔ فاصلہ پر تھا۔ لیکن ۱۹۱۸ء میں جب مصر کو ایک رہنمائے صادق کی ضرورت ہوئی؛ تو قدرتِ الٰہی نے اس کا غیر متوقع سامان کر دیا۔ اور اچانک سعد پاشا کی طاقتور شخصیت نمایاں ہوگئی انہوں نے ایک ہی جست میں وہ پورا فاصلہ طے کر لیا۔ جو اُن کے پنجاہ سالہ دور حیات اور مصر کی تحریک حریت و استقلال کے درمیان حائل تھا۔

حقیقت یہ ہے۔ کہ اگر زغلول پاشا جیسا شخص جس کی تمام زندگی حکومت کے بڑے بڑے ذمہ دارانہ مناصب میں گذر چکی تھی، اور جس کے مداحوں میں لارڈ کرومر تک شریک ہو چکے تھے، اس موقعہ پر مصر کا علم استقلال نہ اُٹھاتا، تو یہ تحریک اس قدر طاقت و اہمیت حاصل نہ کر سکتی جو اُس نے چند ماہ کے اندر حاصل کر لی تھی!۔

فقید الشرق احمد سعد زغلول پاشا مرحوم

(مقالہ نگار الہلال کے قلم سے)

مصر میں ۲۱ ستمبر ۱۹۲۷ء کے اس ہفتہ اہم ترین واقعہ، احمد سعد پاشا زغلول کی بالکل غیر متوقع وفات ہے۔ بین اُس وقت جبکہ میں اُن کی بحالی صحت اور شاہ مصر کی سیاحت انگلستان کے نتائج پر بحث کرنا چاہتا تھا۔ اچانک یہ حادثہ جانکاہ پیش آگیا۔ حیران ہوں اپنا یہ مکتوب کس طرح شروع کروں؟ مرحوم کی سوانحعمری بیان کروں؟ اُن نقصانات کا ذکر کروں۔ جو اس واقعہ سے مصر کو پہنچ سکتے ہیں؟ اُن کے جنازہ کے شاندار جلوس کا ذکر کروں؟ اُن کی جلیل القدر حرم کا ماتم لکھوں؟ وہ نوحہ و بکا بیان کروں جو اس وقت تمام ملک میں برپا ہے، جس کا شور میں اِن سطور کی تحریر کے وقت بھی سُن رہا ہوں، اور جس کا بیان یقیناً میری قدرت سے باہر ہے میں شارع درب الجامیز میں مقیم ہوں۔ میرے پڑوس میں جتنے مکان ہیں ماتمی آثار و علامت سے غمناک ہیں۔ عورتوں اور بچوں تک کے چہرے ان کے دلی حزن و ملال کی شہادت دے رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، گویا قاہرہ کے ہر گھر میں اس کے کسی قریبی عزیز کا ماتم پیش آگیا ہے۔

آغاز مرض

۱۵ اگست کو مرحوم کے کان میں خفیف سا التہاب ظاہر ہوا۔ اور بالآخر

یہی شکایت مہلک ثابت ہوئی۔ وہ اپنے دیہاتی مقام "مسجد وصیف" میں مقیم تھے مرض کی نوعیت دیکھ کر ڈاکٹروں نے رائے دی۔ کہ فوراً قاہرہ واپس آجائیں۔ چنانچہ قاہرہ لائے گئے۔ اور یہاں کے اطباء سے معائنہ کرایا گیا۔

قاہرہ پہنچ کر طبیعت بحال ہوگئی تھی۔ لیکن گذشتہ دوشنبہ کو مرض نے ازسرِنو حملہ کیا۔ بارہ بجے رات کو دائیں پہلو میں درد محسوس ہوا۔ منگل کے دن حرارت برابر بڑھتی رہی۔ صبح ۸ بجے مرحوم نے اپنی حرم سے اچانک کہا "میں ختم ہوگیا!" یہ کہتے ہی زبان بند ہوگئی، اور اسی دن یعنی ۲۳ راگست کی رات کو ۱۰ بجے طائر روح پرواز کر گیا! اناللہ و انا الیہ راجعون!

خبر کیونکر مشہور ہوئی؟

وفات کے دن صبح ہی سے مرحوم کے مکان میں لوگوں کا ہجوم تھا۔ وفات کے وقت ڈاکٹروں کے علاوہ مرحوم کے وفادار مرید اور بھلبیجے فتح اللہ باشا برکات بھی بستر مرگ کے پاس موجود تھے۔ وفات کے بعد ہی وہ نیچے کی منزل میں اتر کر آئے۔ حاضرین نے دوڑ کر حالت دریافت کی۔ مگر وہ کوئی جواب نہ دے سکے۔ سب حیرت میں تھے۔ اور طرح طرح کے قیاسات لگا رہے تھے۔ اسی اثناء میں اوپر سے رونے کی صدائیں بلند ہوئیں۔ اس پر حاضرین دوبارہ فتح اللہ باشا کی طرف دوڑے۔۔ وہ اب بھی چپ تھے۔ لیکن انہوں

نے زور سے اپنے دونوں گھٹنوں پر ہاتھ مارے۔ یہ اشارہ کافی تھا ایک لمحہ کے لئے سب پر سناٹا چھا گیا۔ پھر بیک وقت سب کی آنکھیں اشک بار ہوگئیں۔ یہ حادثہ ایسا دل ہلا ڈالنے والا تھا۔ کہ رونے پر کسی کو ملامت نہیں کی جا سکتی تھی۔ کہرام مچ گیا تھا۔ عین اُس وقت ڈاکٹر شفیق اوپر سے اُتر کر آئے اور مضبوط آواز میں چلائے "سوگوار بیوہ پر رحم کرو! تمہارا رونا اُسے ہلاک کر ڈالے گا۔ سعد مر گئے لیکن اگر تم چاہو۔ تو اُنہیں اپنے دلوں میں ہمیشہ زندہ رکھ سکتے ہو"

مگر یہ وقت نصیحت سننے کا نہ تھا۔ نالۂ و بکا برابر بلند رہا۔ قرب وجوار کے لوگوں نے سُنا۔ تو اُن پر بھی یہی حالت طاری ہوگئی۔ چشم زدن میں یہ یہ منشوم خبر تمام شہر میں پھیل گئی۔ اب کوئی نہ تھا۔ جو اس حادثہ قوم و ملت پر ماتمی نہ ہو!

اُسی وقت تار کے ذریعہ تمام دُنیا میں خبر پھیل گئی۔

سعد پاشا کی بیوہ

سعد پاشا کی وفات پر اُن کی بیوی کا جو حال ہوگا، ظاہر ہے مصر میں ان دونوں کی محبت ضرب المثل اور تمام مردوں اور عورتوں کے لئے نمونہ تھی۔ سعد پاشا کو اُن سے اس درجہ محبت تھی۔ کہ اگرچہ اُن سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ مگر انہوں نے کبھی دوسری شادی کا خیال نہیں کیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ مرحوم نے اپنی تمام دولت اور جائداد بھی اپنی بیوی کو باضابطہ ہبہ

کر دی تھی۔ ظاہر ہے، ایسے وفادار شوہر کی موت اور پھر اُس شوہر کی موت جس کی عظمت ساری دنیا تسلیم کرتی تھی، اُس کی بیوہ کے لیے کیسی عظیم مصیبت ہوگی؟! ادھر کئی سال سے یہ معزز خاتون بیمار ہے۔ ڈاکٹروں نے سختی سے ممانعت کر دی تھی۔ کہ مریض کی خدمت میں حصّہ نہ لے۔ مگر اُس نے صاف انکار کر دیا۔ وہ اِس قدر ناتواں تھی۔ کہ بمشکل چل سکتی تھی۔ اِس پر بھی تیمارداری میں ہمہ تن مشغول رہتی تھی!

اخبارات نے وہ مؤثر مناجات شائع کر دی ہے۔ جو بیوہ نے اپنے متوفی شوہر کی نعش کو مخاطب کر کے کی تھی۔

مجلس وزراء

اطلاع پاتے ہی مجلس وزراء کا ایک فوری جلسہ منعقد ہوا۔ اور اُس نے قوم کے نام حسب ذیل اعلان شائع کیا:۔

"وزراء، انتہائی رنج والم کے ساتھ مصری قوم کو اُس کے عظیم رہنما، سعد پاشا زغلول کی وفات کی جانکاہ خبر پہنچاتی ہے۔ مختصر بیماری کے بعد موت کے بے پناہ ہاتھ نے قوم کے رہنما، اُس کی اُمیدوں کے مرکز، اُس کی بیداری کے قائد، اُس کی حمایت کے علم بردار کو ذرا بھی مہلت دئے بغیر چھین لیا خدا مرحوم پر اپنی رحمت نازل کرے۔ اور قوم کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

جنازہ

رات بھر مرحوم کے مکان میں زائرین کا ہجوم رہا۔ دوسرے دن

صبح ۹ بجے تمام وزراء اور سفراء دول بھی پہنچ گئے۔ بارہ بجے دن کو نعش بالائی منزل سے نیچے لائی گئی۔ اس پر صرف کفنی تھی۔ کوئی قیمتی چادر نہ تھی۔ نیچے آتے ہی پھولوں کی بارش شروع ہو گئی۔ بے شمار ٹوکرے پھولوں سے بھرے ہوئے، لوگ اپنے ساتھ لائے تھے۔ نعش دیکھ کر ایک مرتبہ پھر گریہ و بکا برپا ہو گیا!

اب مصری فوج بھی پہنچ چکی تھی۔ جنازہ سرکاری طور پر اٹھنا طے پایا تھا۔ تمام سرکاری عہدے دار، امراء وزراء، سفراء، پارلیمنٹ کے ممبر، مسلمان قبطی رومی، ارمن، یہودی فرقوں کے علماء، کاہن، ربی اور احبار اپنے اپنے خاص لباس میں موجود تھے۔

جب تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ تو سعد پاشا کی بیگم سیاہ نقاب منہ پر ڈالے برآمد ہوئیں۔ وہ ضعف سے چل نہیں سکتی تھیں۔ کئی عورتوں کے سہارے وہ اپنی موٹر تک پہنچیں، مگر بیٹھنے سے پہلے ہی بیہوش ہو گئیں۔ فوراً متعش دوائیں دے کر انہیں ہوش میں لایا گیا۔ اب وزراء اور فوجی افسروں نے نعش اپنے کاندھوں پر اٹھائی۔ اور توپ کی گاڑی پر رکھی۔ اس وقت کا منظر ناقابلِ بیان ہے۔ معلوم ہوتا تھا۔ مصر کا آسمان و زمین ماتم کر رہا ہے۔ رونے والی عورتوں اور مردوں کی چیخیں باہم مل گئی تھیں۔ کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ نہیں معلوم رونے والوں میں کتنی قوت پیدا ہو گئی تھی، اور ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کے کتنے دریا سما گئے تھے۔ کہ نوحہ و بکا کا سلسلہ کسی طرح بھی رکنے پر نہیں آتا تھا!"

مصری علم

اس وقت محبت وعقیدت کا ایک جھگڑا پیش آگیا۔ فوج کے افسروں نے نعش اٹھانے سے پہلے کہا "جنگی روایات کی رو سے ضروری ہے کہ مرحوم کی نعش پر مصر کا فوجی پرچم ڈالا جائے"۔ ساتھ ہی انہوں نے اپنا پرچم پیش بھی کر دیا۔ مگر مرحوم کی بیوہ نے اس سے انکار کیا۔ انہوں نے ایک ریشمی علم پہلے سے تیار کر لیا تھا۔ انہوں نے اصرار کیا۔ کہ نعش اسی میں لپیٹی جائے۔ مجبوراً افسروں کو اپنی ضد سے باز رہنا پڑا۔

اس کے بعد ملکی افسروں نے کہا "مرحوم کے تمام تمغے اُن کی نعش پر رکھے جائیں۔ کیونکہ وہ ہماری جماعت کے آدمی تھے"۔ مگر بیگم زغلول نے اس سے بھی انکار کیا۔ انہوں نے کہا۔ سب سے بڑا تمغہ مصری علم ہے۔ اس تمغہ پر کوئی دوسرا تمغہ نہیں رکھا جا سکتا"۔

جوں ہی نعش توپ پر رکھی گئی۔ منادی نہایت ہی بلند آواز سے چلایا لا الٰہ الا اللہ۔ البقاء للہ" ہر طرف سے نعرے بلند ہوئے "رحمک یا سعد!" عورتیں چلائیں "فلتحیا ذکری سعد!" ایک عجیب قیامت برپا ہو گئی۔ اگر فوج اور پولیس کا انتظام غیر معمولی نہ ہوتا۔ تو یقیناً بے شمار جانیں ضائع جاتیں کیونکہ نعش کے بلند ہوتے ہی ہزاروں آدمیوں نے یک وقت آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ ہر شخص کی یہی خواہش تھی۔ کہ سعد کی نعش کا بوسہ لے یا کم سے کم اُسے چھو ہی لے۔ مگر فوج اور پولیس نے پُرجوش مجمع کو

روک دیا - اور ٹھیک ۴ بجے جنازہ روانہ ہوگیا۔

جلوس میں سب سے آگے فوج کا ایک بڑا دستہ اپنا جنگی باجا بجا رہا تھا - اُس کے بعد مزدوری پیشہ طبقہ کی مختلف جماعتیں تھیں - ریلوے کے مزدور، کارخانوں کے مزدور، گاڑی بان، لوہار، حجام - غرضکہ مختلف پیشہ وروں کی علیحدہ علیحدہ صفیں تھیں - ان کے پیچھے پھر فوج اپنے باجے کے ساتھ تھی - اِس کے پیچھے مختلف تجارتی کمپنیوں کے مزدور اور کارکن تھے - چھاپے خانوں کے مزدوروں کی صفیں، ان کے بعد تھیں پھر . . . . . "

مگر میرے لئے یہ تمام تفصیل بیان کرنا ناممکن ہے - صرف اس قدر کہدینا کافی ہے کہ قاہرہ میں جتنی جماعتیں اور فرقے موجود ہیں، جتنے مدارس قائم ہیں، جتنی انجمنیں، . . . . بلکہ اگر یہ کہا جائے تو شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ جتنی بھی مخلوق موجود ہے، اُس کا بڑا حصّہ جنازے کے ساتھ ماتم کناں موجود تھا!

اِس جلوس میں ایک قابلِ ذکر بات یہ تھی کہ اُس میں ہر طرف ہلال اور صلیب، دونوں کے علم بلند تھے - دونوں ہوائیں ہلتے تھے - اور ہم آغوش ہو جاتے تھے - یہ نظارہ نہایت ہی پُر اثر تھا - یہ اس حقیقت کا ثبوت پیش کر رہا تھا کہ مصر میں اب ایک ہی عنصر باقی ہے، اور وہ آزادی خواہ مصری قوم ہے - اور یہ کہ سعد زغلول کسی ایک فرقہ کا رہنما نہ تھا، بلکہ مصر کے تمام فرقوں کا یکساں طور پر رہنما تھا - وہ جس طرح

مسلمان مصریوں کا محبوب تھا۔ اُسی طرح مسیحی مصریوں کا بھی محبوب تھا!"

نمازِ جنازہ

ٹھیک ۱ بجے جنازہ، مسجد قیسون میں پہنچا۔ یہاں لاکھوں مخلوق نے نماز جنازہ ادا کی۔ صفوں میں سینکڑوں قبطی عیسائی، اور مصری یہودی بھی مسلمان نمازیوں کے دوش بدوش کھڑے تھے، اور اپنے سردار کی مغفرت کے لئے رب العالمین سے الحاج وزاری کر رہے تھے!

قبر پر!

نماز کے بعد جنازہ پھر آگے بڑھا۔ اور حضرت امام شافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قبرستان کی طرف روانہ ہوا۔ قبر کے قریب پہنچکر جلوس رُکا ۷ آدمیوں نے گاڑی پر سے نعش اُتاری۔ اِن میں دو قبطی عیسائی بھی شامل تھے۔ قبر میں نعش اتارنے والے بھی یہی لوگ تھے۔ اِس وقت کا ماتم ناقابلِ بیان ہے۔ دُنیا کا کوئی قلم کبھی اُسے نہیں لکھ سکتا۔ ایسا ماتم تھا کہ دِل ہلے جاتے تھے۔ ۱۲ معزز آدمی بیہوش ہوکر گر پڑے!

اِس تمام دوران میں قلعہ سے توپیں دغتی رہی تھیں۔ مسیحی گرجوں کے گھنٹے بج رہے تھے۔ تکبیروں کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ قاہرہ پورے معنی میں نشانِ غم بن گیا تھا۔

مٹی دینے سے پہلے فتح اللہ باشا برکات قبر میں اُترے۔ اور مرحوم کو آخری سلام کر کے نکل آئے۔

وزیر داخلیہ کی تقریر

اِس مؤثر موقعہ پر جعفر والی باشا وزیر داخلیہ کھڑے ہوئے اور کہا:-

"سعد، مر گیا۔ اُف! کیسی سخت مصیبت درپیش ہے! یہ ایسی مصیبت ہے جس کا غم کبھی دُور نہیں ہوگا۔ سعد باشا نے جن اعلیٰ اصول پر اپنی زندگی قربان کی، الحمدللہ، اب وہ اصول تمام مصری قوم کے دلوں میں راسخ ہو چکے ہیں۔ اگر یہ جلیل القدر وجود اپنے جسم سے دُور ہوگیا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں، اُس کی رُوح ہمارے اندر برابر زندہ رہے گی۔ ہم سب ایک ایک کر کے اسی طرح مرجائیں گے، مگر قوم اس شخص کی پیدا کی ہوئی روح سے ہمیشہ زندہ رہے گی!"

پارلیمنٹ کی تعزیت

وفات کے دوسرے دن پارلیمنٹ کے تمام ممبر "بیت الامہ" (یعنی قوم کا گھر۔ یہ اُس مکان کا نام ہوگیا ہے جس میں سعد باشا رہتے تھے) میں جمع ہوئے، اور بیگم زغلول کے سامنے حسب ذیل تقریر کی:-

"مرحوم و مغفور رہنما کی حرم محترم!"

" یہ موقعہ ہمارے لئے نہایت ہی دردناک ہے کہ بیت الامہ میں، جبکہ وہ سعد سے خالی ہو چکا ہے۔ اُس کی رفیقِ حیات کی تعزیت کو حاضر ہوں۔

" معزز خاتون! مصری قومیت کی تعمیر میں سعد نے پہلی اینٹ رکھی اُس نے پوری سرزمینِ مصر کو ایک قوم بنا دیا۔ اور اس کا ایک ہی نعرہ قرار دے دیا۔ وہ نعرہ، کامل آزادی کا نعرہ ہے۔ اُس نے پوری قوم کی ایک صف بنا دی۔ خود آگے کھڑا ہوا، اور منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہو گیا۔ اُس نے آزادی کی صفیں آگے بڑھائیں۔ عزت و عظمت کی راہوں میں داخل ہوا۔ تمام مشکلیں حل کر ڈالیں۔ رکاوٹیں دور کر دیں۔ اپنی بے نظیر قربانیوں سے منزلِ مقصود قریب کر دی۔ اپنی بے مثل شجاعت سے ناممکن کو ممکن بنا دیا!"

" سعد، دستوری حکومت کا باپ تھا، محافظ تھا، سپہ سالار تھا، سپاہی تھا۔ پارلیمنٹ کا سب سے پہلے کھولنے والا تھا۔ منبرِ خطابت کو سب سے پہلے بلند کرنے والا تھا۔ حکومت کے ایوان میں سب سے پہلے اُسی کی حق گوئی کی آواز گونجی تھی!"

" سعد ہی نے پارلیمنٹ کے اصول مقرر کئے۔ ضوابطہ بنائے۔ دستور العمل مرتب کیا۔ اُس کی عزت بڑھائی۔ اُس میں عظمت پیدا کی۔ اُسے قوت بخشی۔ اپنے جاہ و جلال کا ایک عظیم پرتو اُس پہ ڈالا، اور وہ پُر جاہ اور پُر جلال بن گئی۔ . . . . "

"سعد اپنی صدارت کی کرسی پر حق و باطل کی سچی میزان تھا۔ دور اور نزدیک کے لئے روشنی کا ستون تھا۔ فصاحت میں صادق البیان تھا۔ پیری میں شباب عزم تھا۔ فیصلہ کی عظمت تھا۔ لفظ میں بلاغت تھا۔ محبت یا فتہ تھا۔ آیتہ الله تھا۔ ہدایت کا نور تھا۔ عقل کا ستون تھا۔ خطابت کا امام تھا"

"محترم خاتون! اس وقت جبکہ حزن و ملال نے آپ کو اپنی موجوں میں لے لیا ہے، اور جبکہ سعد پر رب کریم کی نظر عنایت پڑ رہی ہے، ہم اپنے زخمی دلوں کے ساتھ تعزیت پیش کرتے اور قسم کھاتے ہیں۔ کہ جب تک زندگی باقی ہے۔ کامل آزادی کے حصول کی جدوجہد جاری رکھیں گے اور پورے اتحاد و اتفاق کے ساتھ دستور حکومت کی حفاظت کریں گے۔

"محترم خاتون! سعد نہ آپ کا تھا نہ ہمارا تھا۔ وہ خدا کا تھا اور وطن کا تھا۔ اس نے اپنی تمام جرأت و ہمت، عظیم قربانیاں، عزم راسخ، غرضکہ جتنی بھی مافوق العادت توتیں اسے ملی تھیں، سب کی سب اپنے وطن کی خدمت پر وقف کر دی تھیں، یہاں تک کہ موت آگئی اور اسے شہادت نصیب ہوئی، سعد شہید وطن ہے!"

"سعد اپنی قبر میں آرام سے سوئیے، کیونکہ وہ اپنے پیچھے ایک ایسی قوم چھوڑ گیا ہے۔ جو اسے کبھی فراموش نہیں کرے گی۔ پس سعد پر اس کی زندگی میں سلام ہو۔ اور موت کے بعد قبر میں بھی . . . . "

تقریر یہاں تک پہنچی تھی۔ کہ فتح اللہ باشا نے بالائی کمرے سے چلا کر کہا:۔ حضرات! سعد باشا کی حرم محترم آپ سے درخواست کرتی ہیں۔ کہ

خاموش ہو جائیے۔ وہ کہتی ہیں: "آپ کی تقریر سے میرا دل پھٹا جاتا ہے۔ آپ کی ہمدردی کی از حد شکر گزار ہوں۔ میری زبان اس کے اظہار سے قطعاً عاجز ہے۔ خدا سے میری دعا ہے۔ کہ آپ کو سلامت رکھے۔ زندہ باد مصر!"

سعد پاشا کی حرم کا بیان

صفیہ ہانم زوجہ محترمہ سعد پاشا مرحوم نے قوم کے نام حسب ذیل بیان شائع کیا ہے:۔

میرے فرزندو!

"اگر سعد، جو اب جوار خداوندی میں پہنچ چکا ہے، مجھ اکیلی کا سعد ہوتا۔ تو اس کی موت پر تمہاری تعزیتوں کا شکریہ ادا کرتی۔ لیکن وہ پورے مصر کا سعد تھا، وہ مصر کا سپہ سالار تھا۔ امین تھا۔ اس کی موت کی مصیبت، خود تمہاری مصیبت ہے۔ اس کا ماتم خود تمہارا ماتم ہے۔ اگر مجھے شکریہ ادا کرنے کا کوئی حق پہنچ سکتا ہے۔ تو وہ صرف اسی لحاظ سے کہ اس کی محبت مجھے حاصل تھی۔ اس کی نیکی مجھ پر دائمی تھی۔ اس کے نام کی عزت مجھے نصیب ہوئی تھی اس کی وجہ سے تمہاری محبت اور قومی حکومت کی شفقت مجھے میسر آئی۔ اگر اتنا حق میرے لئے منظور کرو۔ تو میرا شکریہ قبول کر لو۔ ایسا شکریہ، جس کے اخفا کی قدرت میرے دل میں نہیں ہے۔ اور جس کے اظہار سے میری زبان قاصر ہے!"

"میرے بچو! سعد اس کے سوا کچھ نہ تھا۔ کہ ایک اعلیٰ مطمح نظر تھا۔ سعد مر گیا۔

مگر الحمدللہ یہ مطمح نظر ہنوز باقی ہے۔ اس کی محبوب شکل ہم سے اوجھل ہو گئی مگر اُس کی قیمتی یاد ہمارے دلوں میں زندہ رہے گی۔ والذکرا تنفع المؤمنین!

" اگرچہ اُس کی جدائی کے غم نے ہمارے دل توڑ ڈالے ہیں۔ لیکن آؤ، اس غم کو مزید حمیت و شجاعت کا ذریعہ بنائیں۔ یہ غم ہماری ہمتیں بلند کرنے والا اور ہم میں ایک بالکل نیا جوش پیدا کرنے والا ہو۔ کیونکہ شریف غم ایک ایسی قوت پیدا کر دیتا ہے۔ جو بے روک ہوتی ہے! ایسی ہمت لاتا ہے۔ جو لاتناہی ہوتی ہے۔ اگر سعد کا ہم پر کوئی حق ہے۔ تو وہ حق یہی ہے۔ کہ ہم اُمید کو نہ چھوڑیں، کیونکہ یہ پودا اُسی کا لگایا ہوا ہے۔ ہم اُس کے حسنِ ظن کے مطابق ثابت ہوں۔ اس کا کام پورا کریں۔ اُس کی رکھی ہوئی بنیاد پر اپنی عمارت کھڑی کر دیں۔ مصر کو یاد رکھیں۔ مصر کے سوا سب کچھ بھول جائیں۔ مصر ہی ہمارا مبتدا و منتہا ہے۔ اُسی سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور اُسی کی خاک میں مل جانے والے ہیں۔ اگر ہم ایسا کریں گے۔ تو یقین کرو، سعد کو اپنی صفوں میں پائیں گے۔ بلکہ ہر خادم وطن۔ ہر مجاہدِ وطن، سعد کو اپنے دل کے اندر دیکھے گا۔ یہ اس لئے کہ سعد، جس سے ہم محبت کرتے اور جسے ہمیشہ یاد رکھنا چاہتے ہیں، در اصل ہمارا وہ مطالبۂ حق ہے۔ جس کے لئے ہم کوشاں ہیں۔ یعنی آزادی، یعنی خود مختاری اسی پر ہم جیئں گے اور اسی پر مریں گے!"

" میرے عزیزو! آج مصر تمہاری طرف دیکھ رہا ہے، تم بھی اُسے دیکھو وہ تمہیں پکار رہا ہے! تم بھی اُس کی آواز سنو۔ تم نے کبھی اُس کی پکار سے کان بند نہیں کئے۔ آج پھر اُس کی طرف دوڑو، بے شک سعد مر گیا، مگر مصر زندہ

رہے! بے شک قوم کا رہنما مرگیا، مگر قوم زندہ رہے! قومی آرزوؤں کا نشان مٹ گیا۔ مگر قومی آرزوئیں زندہ ہیں۔ آؤ ہم بڑھ کر سعد کا جھنڈا اپنے کاندھوں پر اُٹھالیں۔ وہی اللہ جس نے مصر کے لئے ظلمت غفلت کے بعد نورِ بیداری کی راہ باز کردی تھی، ہمیں آیندہ بھی راہِ راست دکھائے گا اور قوم کے لئے سعد کا نعم البدل پیدا کردے گا . . . . .

سعد پاشا کی یادگار

مجلس وزارت نے سعد پاشا کی یادگار قائم کرنے کے لئے حسب ذیل تجویزیں منظور کی ہیں:۔

(۱) مرحوم کا ایک بلند مجسمہ قاہرہ میں اور ایک اسکندریہ میں قائم کیا جائے۔ یہ دونوں مجسمے مرحوم کو حالت خطابت میں ظاہر کریں گے،

(۲) "بیت الامۃ" (سعد پاشا کا مکان) خرید کر قومی عمارت بنادی جائے اُس کا نام بدستور یہی رہے گا۔ مرحوم کی بیوہ کو زندگی بھر اُس میں رہنے کا حق ہوگا۔

یہ مکان مرحوم نے ۱۹۰۱ء میں تعمیر کیا گیا۔ اور اپنی حرم محترم پر وقف کردیا تھا۔ وزارت نے طے کیا ہے۔ کہ مکان کا وہ تمام سامان اُسی ترتیب سے باقی رکھا جائے گا جس طرح مرحوم کی وفات کے وقت تھا حتیٰ کہ مرحوم کے کپڑے بھی محفوظ رکھے جائیں گے۔ اِن کپڑوں میں ایک سُرخ جُبّہ بھی ہے جو وہ اپنے وطنی لباس کے اوپر پہنا کرتے تھے۔ لکھنے پڑھنے کا بھی تمام سامان

علیٰ حالہ رکھا رہے گا۔ گھر کی ہر چیز پر لکھا جائے گا۔ کہ کب خریدی گئی؟ کیوں خریدی گئی؟ اور مرحوم اُس سے کیا کام لیتے تھے؟

(۳) بیت الامہ ہی میں مرحوم کی نعش دفن کی جائے گی۔ ان کی موجودہ قبر عارضی ہے۔ اس نئے انتظام کی تکمیل اور جدید شاندار مقبرے کی تعمیر کے بعد نعش یہاں منتقل کر دی جائے گی۔

(۴) سعد پاشا "ابیانہ" گاؤں کے جس مکان میں پیدا ہوئے تھے، وہ بھی خرید لیا جائے۔ اور اُس میں شفاخانہ یا مدرسہ جاری کر دیا جائے

(۵) پایۂ تخت میں ایک عظیم الشان شفاخانہ یا یتیم خانہ قائم کیا جائے اور مرحوم کے نام پر اُس کا نام رکھا جائے۔

تعزیت کے پیغام

بیگم زغلول کے نام دُنیا بھر سے تعزیت کے پیغام آرہے ہیں بڑے بڑے آدمیوں اور بادشاہوں نے تار بھیجے ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا پیغام سلطان ابن سعود اور اُن کے بیٹے امیر فیصل کا تھا۔ ان دونوں نے نہایت رنج و ملال کا اظہار کیا ہے۔ اور اس حادثہ کو تمام مشرق کے لئے عظیم خسارہ بتایا ہے۔ اگر میں ان تمام پیغاموں کا ذکر کروں۔ تو چیٹھی بہت طویل ہو جائے گی۔

یورپین اخبارات کے پیغام

یہ معلوم کرنا نہایت اہم ہے۔ کہ زغلول پاشا کی وفات کو یورپ کے

اخبارات نے کس نظر سے دیکھا ہے؟ خصوصاً برطانی اخباروں نے کس طرح اظہارِ خیال کیا ہے؟

ٹائمس آف لنڈن لکھتا ہے :-

زغلول پاشا نے معاملاتِ مصر میں جو حصّہ لیا، اُس کے متعلق تاریخ کا فیصلہ کچھ ہی ہو، لیکن یہ یقینی ہے۔ کہ تاریخ اُنہیں مصر جدید کا سب سے بڑا آدمی شمار کرے گی۔ وہ اپنے اندر ایک حیرت انگیز زندہ رُوح رکھتے تھے اگرچہ زیادہ مضبوط جسم کے مالک نہ تھے۔ وُہ اپنی جسمانی بناوٹ اور شکل و صورت میں مصری "فلاح" (کسان) کا مکمل نمونہ تھے۔ زبردست شخصیّت اور اخلاق رکھتے تھے۔ خارق عادت شجاعت، شدید صراحت، اُن کی نمایاں صفت تھی۔ بڑی قوتِ استدلال، مسکت حجّت، حاضر جوابی، خوشگفتاری اور حیرت انگیز خطابت نے اُنہیں نہایت ممتاز کر دیا تھا۔ محمدؐ علی پاشا اول خدیو مصر کے عہد سے آجتک کسی نے بھی فرعون کی سرزمین میں اپنی معقولیت اخلاقی اقتدار، اور عام محبوبیت حاصل نہیں کی۔ جتنی زغلول پاشا نے حاصل کی۔ اسی قدر نہیں۔ بلکہ مصر جدید کی تاریخ میں وہ پہلے سیاسی رہنما ہیں جنہوں نے قوم کے دل و دماغ، دونوں پر یکساں اثر ڈالا۔ اور ملک کی سیاسی تربیت کی۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے۔ کہ مشرقی رہنما، مغربی رہنماؤں کے مقابلے میں جلد بوڑھے ہو کر معطل ہو جاتے ہیں، لیکن سعد زغلول، اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں وہ اپنی زندگی کے آخری لمحے تک چست و چالاک رہے اور سخت سے سخت دماغی محنت انجام دیتے رہے۔ تاریخ میں بہت کم انتہا پسند انقلابیوں کے

نام ملتے ہیں۔ جو ۵۰ سال کی عمر کے بعد بھی اپنا سیاسی اقتدار اور مقبولیت برقرار رکھ سکے ہوں۔ لیکن زغلول پاشا اپنے آخری وقت تک محبوب و مقبول رہے۔ اُن کی عمر جتنی زیادہ ہوتی گئی، اُسی قدر زیادہ اُن میں سیاسی جوش اور انقلابی رُوح بیدار ہوتی گئی۔ . . . برطانیہ نے زغلول کو جلاوطن کیا تھا۔ لیکن اِس عظیم اِنسان کے دل میں اس وجہ سے کوئی بغض پیدا نہیں ہوا۔ برطانیہ نے دیکھ لیا تھا کہ یہ اُس کا ایک ایسا دشمن ہے۔ جو خندہ پیشانی سے ہر طرح کی ضربیں برداشت کر سکتا۔ اور پُورے حواس سے اُن کا جواب دے سکتا ہے۔ کوئی شخص بھی اس "فلاح" کی شجاعت پر حیرت کئے بغیر نہیں رہ سکتا، جس نے بے شمار مخالف قوتوں سے مقابلہ کیا اور سب کو بالآخر اپنے ارادے کے سامنے جھکا لیا . . . . !"

ڈیلی نیوز لکھا ہے :۔

"زغلول، سالہا سال سے مصر کا معبود تھا۔ سیاسی جنگ میں اُس کی شجاعت و بسالت بے نظیر تھی۔ وہ اپنی قوم کو کامل خودمختاری کی طرف لے جا رہا تھا۔ لارڈ کرزن نے ایک مرتبہ کہا تھا "زغلول" شورش کا غیر مسئول علم بردار ہے!" لیکن کچھ ہو، وہ اپنے ملک کی آزادی چاہتا اور انگریزوں کو وہاں سے نکال باہر کرنا چاہتا تھا۔ مصریوں کے دل میں اُس کی عزت بے حساب تھی۔ وہ ہمارا شریف اور بہادر دشمن تھا"

مینچسٹر گارڈن لکھتا ہے :۔

"زغلول پاشا، تمام مصریوں میں ایک آدمی تھا، اُس کا ظاہر و باطن

ایک تھا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اُسے ۳ مرتبہ جلا وطن ہونا پڑا۔ انگریزوں نے بہت کوشش کی۔ کہ اُسے جاہ و منصب کا لالچ دے کر ملالیں۔ مگر اُس نے ہمیشہ انکار کیا۔ اور کامل خود مختاری کے سوا کبھی کچھ قبول کرنے پر رضامند نہ ہوا۔ سعد پاشا کی ذہانت، اخلاق، خوش مزاجی، ایسی تھی جس کی نظیر مغلوب قوموں کے رہنماؤں میں کبھی نہیں دیکھی گئی "

یہ انگلستان کے متعصب سے متعصب اخبارات کے خیالات ہیں لیبر پارٹی کے اخبارات نے تو اس سے بہت زیادہ لکھا ہے۔ اختصار کے خیال سے ہم ان کا ذکر نہیں کر سکتے۔ یہ تمام رائیں تار کے ذریعہ قاہرہ کے اخبارات میں پہنچی ہیں۔ اور ابھی ان کا سلسلہ برابر جاری ہے

اسی طرح فرانسیسی اخبارات نے بھی طویل و عریض مضمون شائع کئے ہیں۔ اور مرحوم کی بہت تعریف کی ہے۔

نیم سرکاری اخبار "طان" لکھتا ہے: "سعد پاشا مصر کے اس وقت سب سے بڑے آدمی تھے۔ ان کی زندگی کا اکثر حصہ اپنے ملک کے لئے آزادی حاصل کرنے کی جد و جہد میں گزرا۔ وہ دنیا بھر کی نظروں میں معزز و محترم تھے۔ . . . . "

"ایکوڈی پاری" لکھتا ہے "زغلول، مصر کا عظیم آدمی تھا۔ آزادی کا علم بردار تھا۔ مصر میں اُس سے بڑا کوئی آدمی موجود نہ تھا . . . . "

اخبار "دیبا" لکھتا ہے "سعد کی موت نے مصر کو اپنے سب سے بڑے رہنما سے محروم کر دیا۔ اُس کی شخصیت، بہت ہی عظیم تھی . . . . "

سعد پاشا کی زندگی پر ایک نظر

وہ ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوئے۔

"۵ اکتوبر ۱۸۸۱ء کو شیخ سعد زغلول ازہری طالب علم کی سرکاری اخبار الوقائع المصریہ کے ادارۂ تحریر میں تقرری ہوئی۔ ۸۰۰ قرش (ایک قرش ۲۰ کا ہوتا ہے) ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی تھی۔ یہ طالب علم، خوش اطوار ہے شیخ محمد عبدہ نے اُس کے چال چلن کی تصدیق کی ہے" یہ عبارت ایک سرکاری فرمان سے اخذ کی گئی ہے۔ اُس وقت مرحوم، ازہر کے طالب علم تھے اور "شیخ سعد زغلول" کہلاتے تھے۔

یکم فروری ۱۸۸۲ء کو اُن کی تنخواہ ۹۳۳ قرش ہوگئی۔

۳ مئی ۱۸۸۲ء کو "سعد آفندی زغلول" کا تبادلہ وزارت داخلیہ کے محکمہ میں ہوگیا۔ اور تنخواہ ۵ پونڈ مقرر ہوئی۔

۶ ستمبر ۱۸۸۲ء کو "جیزہ" کی کمشنری میں محافظ دفتر کاغذات سرکاری مقرر ہوئے۔

۲۷ جون ۱۸۹۲ء میں ۴۵ پونڈ تنخواہ پر درجہ دوم کے مجسٹریٹ مقرر ہوئے۔

یکم فروری ۱۸۹۴ء میں تنخواہ ۵۵ پونڈ ہوگئی۔

یکم جنوری ۱۸۹۶ء میں تنخواہ ۶۰ پونڈ قرار پائی۔

۸ اپریل ۱۸۹۹ء میں انہیں پہلا سرکاری تمغہ دیا گیا۔

۱۲ر جنوری ۱۹۰۴ء میں انہیں تیسرا نشان مجیدی عنایت ہوا۔
یکم جنوری ۱۹۰۶ء میں اُن کی سالانہ تنخواہ ایک ہزار پونڈ ہوگئی۔
۲۸ر اکتوبر ۱۹۰۶ء میں "سعد زغلول بک" وزیر تعلیم مقرر ہوئے
۱۲ر نومبر ۱۹۰۶ء میں "پاشا" کا خطاب ملا۔
۱۸ر جنوری ۱۹۰۸ء میں "مجیدی اول" کا تمغہ ملا۔
۲۳ر فروری ۱۹۱۰ء میں محکمہ عدالت کے وزیر مقرر ہوئے۔
۲۷ر جنوری ۱۹۲۴ء میں وزیر اعظم مقرر ہوئے۔
۲۳ر مارچ ۱۹۲۵ء میں پہلی مرتبہ پارلیمنٹ کے صدر مقرر ہوئے۔
۱۰ر جون ۱۹۲۶ء میں دوسری مرتبہ پارلیمنٹ کے صدر مقرر ہوئے۔
۲۳ر اگست ۱۹۲۷ء میں فوت ہوگئے

"مرحوم سعد پاشا زغلول کی بلیغ تقریریں"

مرحوم احمد سعد پاشا زغلول کی فصاحت و بلاغت اور قوت خطابت مشہور عالم ہے۔ اُن کی مقبولیت اور سیاسی زعامت کی کامیابی میں ایک بڑا راز اُن کی یہی ساحرانہ خطابت ہے۔ ہم چاہتے ہیں۔ ان کی بعض مشہور تقریروں کے اقتباسات وقتاً فوقتاً شائع کرتے رہیں۔ ادبی خوبیوں کے علاوہ ان سے مرحوم کا سیاسی مذہب اور فکری رجحان بھی معلوم ہوگا۔

شہیدانِ وطن کی یاد

ہمہ تن خشوع ہو کر اُن پاک رُوحوں کی طرف، بہادروں کی روحوں کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، جنہوں نے حق کا اعلان کیا۔ حالانکہ حق کا اعلان، مصر میں سب سے بڑا جُرم تھا۔

"وہ حق کا ڈنکا بجاتے آگے بڑھے۔ اُن کی بےلاگ شجاعت نے ہمیں سُرخ رُو کر دیا۔ سب کو وطن کے احترام پہ مجبور کر دیا۔ وہ اپنا فرض انجام دے چکے۔ اب وہ آرام سے اپنی قبروں میں سوئیں۔ آزادی کی سُہانی صبح اُن کے خون سے سہانی ہوئی، غلامی کی ظلمت چاک کر کے نکل آئی۔ اللہ اُن کی قبریں روشن کرے۔ فردوسِ بریں میں انہیں اُتارے۔ ہمارے عمل سے اُن روحوں کو خوش کرے۔

نوجوان

"میری قوم کی جوانی پر خدا کا سایہ! نوجوانوں نے جوانی کے اُن تمام خزانوں کے منہ کھول دیئے۔ جو اُن کے سینوں میں بند تھے۔ پورے مُلک کو جوش اور خودداری سے لبریز کر دیا۔ دلوں میں عظمت پیدا کی، سروں میں حکمت اُتاری۔ جسموں میں نظام قائم کر دیا۔ نوجوان ہی ہماری تحریک کا اصلی ستون ہیں۔ مصر کے لیے روشنی کا مینار ہیں۔ مستقبل انہیں کے ہاتھ میں ہے۔ اور نوجوان ہاتھوں کی قوت معلوم ہے۔"

علماء دین

"میں علماء اسلام اور مسیحی قسیسوں کا شکر گزار ہوں۔ انہوں نے متحد ہو کر دشمن کی سب بڑی حجت باطل کر دی۔ تمام اختلافات دور کر دئے ہیں اور ثابت کر دیا۔ کہ سب دین اپنی غرض میں ایک ہیں۔ سب وطن کی مدافعت فرض قرار دیتے ہیں۔ سب کا تعلق، خالق ارض و سما کی عبادت سے ہے۔ سب وطنی مصلحت میں مخلوق کو اتحاد کی دعوت دیتے ہیں"

اصول نہ کہ اشخاص

"سعد اور اس کے رفیق، تم میں انبیاء نہیں ہیں جنہوں نے معجزے دکھائے۔ اولیاء نہیں ہیں۔ جنہوں نے کرامتیں دکھائی ہیں۔ وہ تمہارے ہی افراد ہیں، تمہارے اصول کے خدمت گزار ہیں۔ تمہارے ہی آدمی ہیں، تمہارے شعور کا انہوں نے احساس کیا۔ اور تمہارے اصول سے لبریز ہو گئے۔ چنانچہ وہ اُن کی خدمت کے لئے اُٹھ کھڑے ہوتے۔ پس ہمارے لئے کوئی فخر نہیں۔ اور اگر ہے۔ تو وہ سب کا فخر ہے۔

بلاشبہ میں نے کچھ خدمت کی ہے۔ لیکن میں نے کوئی قربانی نہیں کی۔ کیونکہ میں بے روزگار تھا۔ البتہ میرے ساتھیوں نے قربانیاں کی ہیں۔ انہوں نے اپنے منصب اور عہدے چھوڑے۔ حتیٰ کہ اپنی

اولاد تک کی جدائی گوارا کی، اور آپ جانتے ہیں۔ کہ میرے کوئی اولاد بھی نہیں (اس پر حاضرین پکارے۔ ہم سب آپ کی اولاد ہیں) بلا شبہ تم سب میری اولاد ہو۔ لیکن میں خوب جانتا ہوں۔ کہ یہ تمام اعزاز اشخاص کے لئے نہیں۔ اصول کے لئے ہے۔ وہ اصول سعد اور سعد کے رفقاء سے کہیں بلند ہے۔"

اتحاد

میری نظر میں سب سے بڑی اور محبوب چیز مسلمانوں اور قطبیوں کا اتحاد ہے۔ یہ علم، جو اس مبارک اتحاد کا نشان ہے، مجھے دنیا اور دنیا کی سب چیزوں سے زیادہ عزیز ہے۔ یہ علم میرے ہاتھ میں دے دو، میں وعدہ کرتا ہوں۔ کہ اپنی پوری قوت سے اس کی حفاظت کروں گا۔ اور زندگی کے آخری لمحے تک اسے بلند رکھوں گا۔ "مسلمان" اور "عیسائی"۔ لیکن میں مسلمان اور عیسائی نہیں چاہتا۔ مصر میں صرف ایک قوم ہونا چاہیئے۔ اور وہ مصری قوم ہے"

وکالت

وکلاء کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے مرحوم نے کہا:۔

"میری خدمتوں کی دھوم مچی ہوئی ہے، حالانکہ میں جانتا ہوں۔ کہ میرے لئے ان خدمتوں پر فخر کرنا روا نہیں ہے۔ لیکن میں آپ کی اجازت

سے صرف اِس بات پر فخر کرنا چاہتا ہوں۔ کہ مَیں وکالت کے پیشے میں داخل ہوا۔ اور اُس کی خدمت کی۔

"ہاں، مَیں اِس خدمت پر بہت زیادہ فخر کرتا ہوں۔ مجھے کوئی انانیت کا الزام نہ دے۔ کیونکہ مَیں جانتا ہوں اُس زمانے میں اس پیشہ کا کیا حال تھا؟"

"مَیں نے وکالت کا پیشہ اُس وقت اختیار کیا جب یہ پیشہ معزز نہ تھا جیسا اِس وقت ہے۔ بلکہ وہ حقیر سمجھا جاتا تھا۔ اور اُس کے آدمی بھی حقیر سمجھے جاتے تھے۔ یہ پیشہ اصل میں جس قدر شریف تھا۔ ہمارے ملک میں اُسی قدر ذلیل ہوگیا تھا۔ وکیل اور دغا باز، یہ دونوں لفظ ہم معنی سمجھے جاتے تھے۔ اونچے خاندان کا کوئی رُکن بھی اُس میں داخل نہیں ہوتا تھا۔ اور سچ یہ ہے۔ کہ اُس وقت خود وکلاء کو بھی اپنی عزتِ نفس کا کوئی خیال نہ تھا۔

"لیکن یہ سب جانتے ہوئے بھی میں اِس پیشہ میں دَر آیا۔ بلاشبہ یہ ایک بڑی اخلاقی شجاعت کا کام تھا۔ مَیں سُنا کرتا تھا۔ کہ لوگ، وکیل اِس لیے بنتے ہیں۔ کہ مکر و فریب کی راہوں سے دَولت کمائیں۔ مَیں نے کہا۔ لیکن مَیں اِس لئے وکیل بنوں گا۔ کہ حق و عدالت کی خدمت کر سکوں۔

یہ اُس وقت کی بات ہے۔ جب وکیل، حاکم عدالت کے رحم پر ہوتا تھا۔ اُس کی ذرا سی ناراضی بھی، وکیل کو اپنی کمائی سے محروم کر دیتی تھی۔

ایک دن ایسا ہوا۔ کہ مَیں ایک مقدمہ پر بحث کر رہا تھا۔ سرکاری

وکیل نے کہا۔ آج پیشی بڑھا دی جائے۔ مَیں نے اعتراض کیا۔" مقدمہ کا التوا نا روا ہے، کیونکہ ملزموں کو قید خانے میں بلا سبب رکھنا نا جائز ہے، حاکم خفا ہوگیا۔ "فوراً اپنے الفاظ واپس لو۔" حاکم نے کہا۔" عدالت کے لئے کوئی بات بھی نا روا اور نا جائز نہیں ہے" لیکن مَیں نے الفاظ واپس لینے سے انکار کیا۔ اور سخت صورت حال کا مقابلہ کیا۔

" اِسی طرح کے بہت سے واقعات پیش آتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ زمانہ آگیا۔ جب یہ پیشہ معزز ہوگیا اور حکام، وکلاء کی دوستی پر فخر کرنے لگے۔"

قومی نگرانی کے حدود

ہم قوم کے نمایندے ہیں۔ قوم کو ہماری نگرانی کا حق ہے۔ قوم کا فرض ہے کہ وہ اپنا مطالبہ ہمیں بتائے۔ اُس نے یہ مطالبہ ہمیں بتا دیا ہے۔ کہ "کامل آزادی" اَب ہم کوشش کرتے ہیں۔ قوم کو یہ حق نہیں ہے۔ کہ وہ کوشش کی راہیں بھی ہمارے لئے مقرر کرے۔ قدم قدم پر ہم سے باز پرس کرے۔ اگر ہم کسی سے گفتگو کریں۔ تو ہم سے روداد طلب کرے۔ اگر ہم کہیں جائیں۔ تو ہم سے وجہ دریافت کرے۔ قوم کو چاہیے۔ کہ خاموشی سے ہماری کوششیں دیکھے۔ جب ہم اُس کے سامنے اپنی کوشش کے نتائج پیش کریں۔ تو بلاشبہ اُسے حق ہے کہ ہماری تجویزیں خوب جانچے۔ اگر اُس کی پسند کے مطابق نہ ہوں۔ تو ٹھکرا دے۔ ہمیں ہرگز کوئی شکایت نہیں ہوگی۔"

آزادی کی نعمت

ہم دُنیا کی ہر نعمت سے محروم ہو جانے پر طیار ہیں۔ سب آرام، ہم سے چھین لو، ہمارا مال و دولت بھی ضبط کر لو۔ ہم اِس سَب پر صبر کر لیں گے، مگر اے ہمیں غلام بنانے والو! یاد رکھو، ہم آزادی سے ہرگز دست بردار نہ ہونگے آزادی، خدا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ اُس سے محرومی خود زندگی سے محرومی ہے۔

قومی وَحدت

"قوم اِس کے سوا کچھ نہیں کہ انسانوں کا ایک مجموعہ ہے، وہ مجموعہ جس کی مصلحت ایک ہے، جس کا شعور ایک ہے، جس کی آرزو ایک ہے۔ ہماری قوم کی اس وقت آرزو کیا ہے؟ کامل خود مختاری!

ہماری قومی وَحدت مضبوط بنیاد پر قائم ہے۔ اُس میں نہ فرقے ہیں۔ نہ درجے ہیں۔

وہ جھوٹے ہیں۔ جو کہتے ہیں۔ کہ "باشاؤں" (امیروں) کا گروہ پوری قوم پر حاوی ہونا چاہتا ہے۔ ہمارے ملک میں نہ "باشاؤں" کا کوئی خاص گروہ ہے نہ "فلاحین" (کسان) کا۔ ہم سب "باشا" بھی ہو سکتے ہیں۔ اور "فلاح" بھی ہو سکتے ہیں۔ میرے اپنے خاندان کے اکثر افراد فلاح ہیں۔ لیکن مَیں سعد زغلول باشا ہوں۔

"وہ جھوٹے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہمارے اندر دینی فرقے موجود ہیں۔ ممکن ہے۔ پہلے کبھی ہوں، لیکن اب کوئی فرقہ نہیں ہے۔ اور اگر کوئی ہے۔ تو وہ ایک ہی فرقہ ہے۔ یعنی مصری قوم، جب سے جدید بیداری کا سورج طلوع ہوا ہے۔ ہلال اور صلیب نے ہمیشہ کے لئے معانقہ کر لیا ہے۔ یہ معانقہ صرف مسلمان اور قبطی کا معانقہ نہیں ہے۔ یہ مسلمانوں کا دنیا بھر کی قوموں اور مذہبوں سے اتحاد کا نشان ہے۔ ہم متعصب نہیں ہیں۔ ہم شیطان کے پجاری نہیں ہیں جو انسانوں میں پھوٹ ڈالتا ہے۔ ہم خدا کے پرستار ہیں۔ جو انسانوں میں محبت کا رشتہ پیدا کرتا ہے۔"

سعد پاشا زغلول کے اقوال

مرحوم احمد سعد پاشا زغلول کو مصر میں جو رسوخ و عظمت حاصل ہوئی، اُس میں اُن کی دوسری قابلیتوں کے علاوہ اُن کی قوتِ خطابت اور بلاغتِ تحریر کو بھی بڑا دخل تھا۔ ذیل میں اُن کے بعض اقوال کا ترجمہ دیا جاتا ہے۔ جو ضرب الامثال کی طرح مشہور ہو گئے ہیں:۔

کامل آزادی

مصر، کامل آزادی کا مطالبہ کرتا ہے، کیونکہ آزادی، قوموں کا پیدائشی حق ہے

نا اُمیدی

اِس وقت ہماری حالت کیسی ہی ابتر ہو۔ مگر ہماری قوم جیسی کوئی بڑی قوم، کبھی اپنی قسمت کی طرف سے نا اُمید نہیں ہو سکتی!

حاکم و محکوم کی مصلحت

حاکم قوم کی مصلحت ہمیشہ اُس کی محکوم قوم کی مصلحت سے متضاد ہوا کرتی ہے۔

عہدے کی خواہش

اپنے آزاد وطن میں ایک حقیر فرد رعایا بن کر رہنا مجھے اس سے کہیں زیادہ پسند ہے۔ کہ اجنبی حکومت کے ماتحت بڑے سے بڑے عہدے پہ مقرر ہوں۔

مادّی قوّت

مادی قوت، قوم کے ارادے پہ کبھی غالب نہیں آسکتی۔

صحیح تحریک

ہر صحیح تحریک، ضرور کامیاب ہوتی ہے۔

زمانے کے انقلابات

زمانے کے انقلابات دوست کو دشمن اور دشمن کو دوست بنا دیتے ہیں

سیاسی اتفاق

مِصر اور انگلستان کے درمیان اتفاق کے معنی صرف ایک ہیں۔ یعنی

مصر کی کامل آزادی۔

انتہا پسندی

آزادی کے طلب گار، انتہا پسند نہیں ہوتے۔ اس لئے کہ یہ تو ایک ابتدائی چیز ہے۔ غلامی پسند کرنے والے البتہ انتہا پسند ہیں۔ کیونکہ غلامی ذلّت نفس کی انتہا ہے!

قومی روح

قوم کی رُوح نہ جنگی قوانین سے مغلوب ہو سکتی ہے، نہ ظلم سے، نہ دُنیا کی بڑی سے بڑی سلطنت کی قوت سے۔

اصُول نہ کہ اشخاص

اگر سعد، قومی اصُول سے ہٹ جائے۔ تو اسے گرا دو!

نکتہ چینی

مَیں اپنی ذات پر نکتہ چینی سُن کر خوش ہوتا ہوں۔ اگرچہ وہ جھوٹی ہی ہو۔

اَبنائے وطن کو نصیحت

اَبنائے وطن! تم میں سے ہر شخص کا فرض ہے کہ میری نگرانی کرے۔ صرف سعد ذمہ دار نہیں ہے، وطن کا ہر فرزند ذمہ دار ہے۔

قومیّت

یہ دیکھ کر میری مسرّت بے حساب ہو جاتی ہے۔ کہ مصر میں صرف ایک ہی فرقہ موجود ہے، اور وہ مصری قوم ہے۔

قومی زندگی

یہ بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ یہ جماعتوں کا سوال نہیں ہے۔ یہ قومی زندگی کا مسئلہ ہے!

میٹھے بول

انگریز، گفتگو میں بڑے ماہر ہیں۔ وہ جانتے ہیں۔ کہ میٹھے بول ہمیں مسخر کر لیتے ہیں!

ہمارا مطالبہ

ہمارا مطالبہ بہت لمبا چوڑا نہیں ہے۔ ہمارا مطالبہ صرف ایک لفظ ہے "آزادی"!

سعد کی زندگی

سعد، مرکر بھی ہمیشہ زندہ رہے گا۔ کیونکہ ہر مصری، سعد ہے، بلکہ سعد سے بھی زیادہ!

مصری قوم

آج مصری قوم وہ نہیں ہے۔ جو کل تھی۔ آج مسلم اور غیر مسلم الگ الگ نہیں ہیں۔ سب ایک قوم ہیں اور صرف ایک خواہش رکھتے ہیں۔ یعنی آزادی! اور وطن!"

عداوت

میں دعوے سے کہتا ہوں، کہ [illegible] سے دل میں کسی آدمی کی [illegible] نہیں ہے۔ کیونکہ عداوت، کمزوروں کا اخلاق ہے

قومی عزت

میں کہہ چکا ہوں، کہتا ہوں، کہتا رہونگا۔ کہ جو عزت میری قوم نے مجھے دی ہے؛ وہ میرے لئے قابلِ فخر ہے۔

میرا دل

میرے دل میں نہ حسد ہے، نہ کینہ ہے۔ میرے دلمیں قومی امانت نے کسی چیز کے لئے بھی جگہ خالی نہیں چھوڑی ہے۔

آزادی کا استحقاق

جو قوم اپنے فرزندوں کا خون اس لئے بہتے دیکھتی ہے۔ کہ وہ آزادی چاہتے ہیں۔ اور پھر خاموش رہتی ہے؛ وہ یقیناً آزادی کا استحقاق نہیں رکھتی!

وزارت

ہم وزارت کے دشمن نہیں ہیں۔ لیکن غیر قومی وزارت دیکھ نہیں سکتی

میرا اخلاق

میں چلانے والا ہوں، سازشی نہیں ہوں۔

میری آرزو۔

آزادی، میری آرزو ہے۔ جو ہاتھ بھی آزادی لائے، میں سب سے پہلے اُس کا بوسہ لوں گا، اگرچہ وہ میرے جانی دشمن ہی کا ہاتھ کیوں نہ ہو۔

خود اعتمادی

خود اعتمادی، خود اختیاری وصف نہیں ہے؛ بلکہ پیدائشی صفت ہے خود اعتماد آدمی اگر یہ وصف دور بھی کرنا چاہے تو دور نہیں کر سکے گا۔"

میری دشمنی

میں نے اگر کسی سے دشمنی کی ہے۔ تو صرف اپنی قوم کی مصلحت کی وجہ سے

رُو رعایت

قومی حقوق میں رُو رعایت دخل نہیں پا سکتی۔

ناکامی

شر پر قوت سے جو کچھ جمع کیا ہے، بکھر جائے گا۔ طمع نے جو کچھ جوڑا ہے، ٹوٹ جائے گا۔ جس کی بنیاد جھوٹ پر ہے، وہ یقیناً گر پڑے گا!"

ناکامی کی علت

ناکامی کی اصلی علت، کارکنوں کی باہمی بے اعتمادی ہوتی ہے،

صبر و برداشت

ہاں ہم پر مصائب بے شمار ہیں۔ لیکن وہی قوم زیادہ عظمت حاصل کرتی ہے۔ جو زیادہ مصائب برداشت کر سکتی ہے۔

برطانیہ کی ضرورت

اگر برطانیہ کو مصر کی ضرورت ہے۔ تو مصر کو اس سے کہیں زیادہ اپنی ضرورت ہے۔

قوت

اگر ہم طاقتور ہوتے۔ تو کسی کو یہ کہنے کی جرأت نہ ہوتی کہ مصر ہمارے قبضہ میں رہنا چاہیے!

منفعت

اگر ملکیت میں منفعت کا اصول تسلیم کر لیا جائے، تو دنیا تہ و بالا ہو جائے کیونکہ ہر شخص کی منفعت اسی میں ہے کہ ساری دنیا ری کا مالک بن جائے۔

عمل اور قربانی

کوئی عملِ حق ضائع نہیں ہوتا۔ کوئی قربانی رائگاں نہیں جاتی۔

ضرورت اور قوّت

کسی زمانہ میں بھی ضرورت، قانون نہ تھی۔ کسی وقت میں بھی قوت، حق کا معیار نہ تھی!

ظلم

ہر ظلم اپنے دامن میں مظلوم کے لئے خوشخبری اور ظالم کے لئے سزا چھپائے ہوتا ہے!

مصطفےٰ فاضل پاشا

انیسویں صدی کے وسط میں دولت عثمانیہ کی سیاسی و اجتماعی اصلاحات کی جو حرکت شروع ہوئی تھی، عام طور پر اس کی ابتدائی تخم ریزی مرحوم مدحت پاشا کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے۔ کہ مدحت پاشا اس روح تجدید کا داعی اول نہ تھا۔ اسے منظم و وسیع کرنے والا تھا۔ ترکی اصلاح و تجدید کی اصلی تاریخ مصطفےٰ فاضل پاشا سے شروع ہوتی ہے۔ فی الحقیقت نوجوان ترکوں کی اجتماعی حرکت کا حقیقی موسس وہی تھا۔

اصلاح کی ابتدائی فضا

عثمانی دار الخلافہ میں جس شخص نے یورپ کے تمدنی انقلاب کا پہلے پہل مطالعہ کیا، وہ مصطفےٰ رشید پاشا تھا۔ امراء دولت میں یہی پہلا شخص ہے جس نے یورپ کی زبانوں سے واقفیت حاصل کی۔ اس کی نشو و نما سلطان محمود مصلح کے عہد میں ہوئی تھی۔ ۱۸۳۹ء میں جب سلطان موصوف کا انتقال ہوا اور سلطان عبد المجید تخت نشین ہوا، تو یہ لندن میں عثمانی

سفیر تھا۔ سلطان عبد المجید نے اس منصب سے ترقی دی۔ اور وزارتِ خارجہ پر مامور کر دیا۔ یہ اسی شخص کی سعی کا نتیجہ تھا کہ اسی سال کے ماہ جون میں دولت عثمانیہ کی تنظیم و اصلاح کا وہ تاریخی فرمان صادر ہوا، جو "خط گل خانہ" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا نام "گل خانہ" اس لئے ہوا کہ سوائے "توپ قپو" کے چمنستان (گل خانہ) میں اُس کا اعلان ہوا تھا اُس اعلان میں دولت کے قانونی اور منظم ہونے کا یقین دلایا گیا تھا نیز مسلم اور ذمی کے حقوق کے مساوی ہونے، اور ہر طرح کے غیر قانونی امتیازات کے منسوخ کر دینے کا اعلان تھا۔

مصطفیٰ رشید پاشا نے اپنے عہد وزارت میں تعلیمی و معاشرتی اصلاحات کی جو روح پیدا کی تھی، اُس کا نتیجہ یہ تھا۔ کہ ایک قلیل جماعت نئے تعلیم یافتہ افراد کی پیدا ہو گئی۔ ان میں سب سے زیادہ نامور شخص دو ہوئے۔ عالی پاشا اور فواد پاشا۔ دونوں نے صدارت و نظارت کے مناصب تک ترقی کی، اور اپنے عہد کے مشاہیر مدبرین میں شمار کئے گئے۔ سلطان عبد المجید کے عہد کے تمام اجراآت اصلاحیہ کی باعث و کارفرما شخصیتیں یہی تھیں۔ معاہدۂ پیرس (۳۰ مارچ ۱۸۵۶ء) میں دولت عثمانیہ کو جو کامیابی ہوئی، اور انگلستان، فرانس اور اٹلی نے روس کے برخلاف ساتھ دیا۔ وہ بہت کچھ انہی دونوں کی مساعی کا نتیجہ تھا۔ معاہدۂ پیرس کے بعد ہی تاریخ اصلاح عثمانی کا دوسرا فرمان شائع ہوا تھا۔ جو "خط شریف" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس میں

خط گل خانہ" کی مزید تائید کی گئی تھی، اور تمام رعایا کی آزادی حقوق کے احترام کا یقین دلایا گیا تھا۔ یہ بھی تمام تر فواد اور عالی ہی کی مساعی کا نتیجہ تھا۔

مصطفےٰ فاضل

مصطفےٰ رشید، فواد، اور عالی پاشا نے اصلاح و تغیر کے لئے فضا پیدا کر دی، مگر جماعت پیدا کرنے کا کام بعد کو ہونے والا تھا۔ یہ مصطفےٰ فاضل پاشا کی شخصیت تھی، جس نے اس نئی فضا کو نشوونما دی، اور "نوجوان" ترکوں کی جمعیت کا اولین سنگ بنیاد رکھ دیا۔ مدحت پاشا بعد کو آیا۔ تاکہ اپنے عظیم اعمال اور عظیم قربانی سے اس سنگ بنیاد پر ایک نئی عمارت چن دے!

مصطفےٰ فاضل پاشا محمد علی بانی خاندان خدیویۂ مصر کا پوتا اور ابراہیم پاشا فاتح حجاز و شام کا بیٹا تھا۔ ۱۸۳۰ء میں پیدا ہوا۔ اور مصر میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ مصر میں محمد علی کے زمانے سے مغربی علوم و السنہ کی اہمیت کا احساس عام ہو چلا تھا، اور خاندان خدیوی کے تمام افراد فرانسیسی زبان کی تعلیم حاصل کرنے لگے تھے۔ مصطفےٰ فاضل کو بھی اس کا موقعہ ملا۔ اس طرح مغربی علوم و تمدن کے فہم و مطالعہ کا دروازہ اس پر کھل گیا۔ ابھی سلطان عبد المجید ہی کا زمانہ تھا کہ وہ قسطنطنیہ آیا۔ اور چند سالوں کے بعد جب سلطان عبد العزیز تخت نشین ہوا۔ تو نظارت معارف (تعلیم) کا ناظر

مفرّر ہوگیا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد جب مالیات کی وزارت کی جگہ خالی ہوئی تو حکومت کی نظرِ انتخاب اسی پر پڑی۔

لائحہ اصلاحیہ

یہ وہ وقت تھا جبکہ دولتِ عثمانیہ کی زوال پذیر ہستی کی حفاظت کے لئے اصلاح و علاج کی آخری مہلت درپیش تھی، اور قریب تھا کہ ہمیشہ کے لئے اس کی شش صد سالہ عظمت و جلال کی دیواریں سرنگوں ہو جائیں سلطان عبدالمجید نے اسے بلند کرنا چاہا۔ اگر سلطان عبدالعزیز کا وجود بھی اس سلسلۂ اصلاح کی تیسری کڑی ہوتا، تو بہت ممکن تھا، اصلاح و تجدد کی راہیں باز ہو جاتیں۔ لیکن عبدالعزیز کے مجنونانہ استبداد نے جس کے ساتھ شخصی حکمرانی کے تمام دروازے مسدود کر دئیے۔ خزانہ بالکل خالی تھا۔ یورپ سے قرضوں پر قرض لئے جا رہے تھے۔ مالیات کے بہترین وسائل مکفول ہو گئے تھے۔ روس نے پیٹرسبرگ سے سرائے دولمہ باغیچہ تک اپنی مخفی سازشوں کا جال بچھا دیا تھا۔ روسی سفیر جنرل اگناٹف کا اقتدار روز بروز بڑھ رہا تھا اور سلطان اپنے تمام معاملات میں اسی کے مشوروں پر کاربند تھا۔ سلطان کا تمام وقت محل کی عیش پرستیوں میں صرف ہوتا۔ بسا اوقات ایک ایک مہینے تک وزراء حکومت کو باریابی کا موقعہ نہیں ملتا۔ شخصی حکومتوں کا قدرتی مزاج ہی شخصی انانیت اور مستبدانہ قہر و جبر کا ہوتا ہے۔ پھر اگر خصوصیت کے ساتھ اس کا کوئی حکمران "مستبد" ہو جائے۔ تو ظاہر ہے۔ اس کا استبداد کس درجہ

لاعلاج اور بے پناہ ہوگا؟ تمام ترک اہلِ قلم متفق ہیں۔ کہ عبدالعزیز اپنے تمام پچھلے مستبد حکمرانوں سے بھی زیادہ مستبد تھا۔ کوئی بات بھی اسے اس درجہ طیش وغضب میں نہیں لاتی تھی جس قدر اس بات کا تصوّر، کہ دنیا کی کوئی مخلوق اُسے "مشورہ" دینا چاہتی ہے، یا نصیحت کرنے کی جرأت رکھتی ہے۔ ابتداء میں جو لوگ بھولے سے کوئی ایسی جرأت کر بیٹھے، انہیں فوراً اس کی سزا بھگتنی پڑی۔ اس صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ تھا۔ کہ کارخانۂ سلطنت روز بروز درہم برہم ہو رہا تھا، اور آنے والے خطرے کے آثار قریب سے قریب تر ہونے لگے تھے۔ یہ حالت جاری تھی، مگر ہر طرف غفلت و اعراض کا سناٹا چھایا تھا۔ کوئی صدا نہ تھی جو کلمۂ حق و اصلاح سے آشنا ہوتی!

لیکن غفلت و افساد کے اس سکون میں بالآخر جنبش ہوئی، اور دولت عثمانیہ کی تاریخ میں پہلی مرتبہ دعوت الی الحق کی بے خوف صدا بلند ہوئی۔ یہ مصطفیٰ فاضل کی صدا تھی۔ وہ صدائے حق، جسے نہ تو سلطان عبدالعزیز کی سطوت و جبروت روک سکی، نہ امارت و وزارت کے مطامع مانع آسکے!

تاریخ میں یہ صدا، اصلاح "لائحہ اصلاحیہ" کے نام سے مشہور ہے یہ دراصل ایک مکتوب ہے۔ جو سلطان عبدالعزیز کے نام لکھا گیا تھا مصطفیٰ فاضل نے یہ مکتوب ۱۸۶۶ء میں لکھا، اور بذاتِ خاص سلطان کے حوالہ کیا۔ لوگوں کو جب اس جسارت کا حال معلوم ہوا۔ تو شدّتِ تحیر سے

انگشت بدنداں رہ گئے۔ دولت عثمانیہ کی تاریخ میں یہ بالکل ایک نئی قسم کی عبارت تھی۔ ایسی عبارت جس کی مصطفیٰ رشید، فواد پاشا، اور عالی پاشا جیسے مصلحین بھی جرأت نہیں کرسکتے!

سلطان عبدالعزیز نے یہ لائحہ پڑھا، اور وہی نتیجہ نکلا جو متوقع تھا۔ مصطفیٰ فاضل کو قسطنطنیہ سے ہجرت کرنی پڑی۔ وہ پیرس آیا۔ اور ایک مدت تک کے لئے یہاں مقیم ہوگیا۔ مصطفیٰ فاضل کے اسی قیام پیرس سے نوجوان ترک جماعت کی سب سے پہلی بنیا دپڑی۔ قسطنطنیہ کے متعدد نوجوان بتدریج پیرس چلے آئے، اور مصطفیٰ فاضل کی امداد و سرپرستی میں متحدہ زندگی بسر کرنے لگے۔ اُس عہد کے وہ تمام اصلاح پسند افراد جنہوں نے نہ صرف دولت عثمانیہ کے لئے سیاسی انقلاب کی تخم ریزی کی، بلکہ ترکی علم ادب و کتابت میں بھی دورِ جدید کی بنیاد ڈالی۔ اسی عہد کی پیداوار ہیں۔ نامق کمال بئے ضیا پاشا ادیب سعداللہ پاشا، ابوالضیا توفیق، وغیرہم کی نشو و نما اسی دور میں ہوئی۔

مصطفیٰ فاضل کو اس عبارت کا صلہ صرف مہاجرت ہی کی صورت میں نہیں ملا، بلکہ اُس کی تمام ترکی جائداد بھی ضبط کرلی گئی۔ اگر فرانسیسی حکومت درمیان نہ پڑتی۔ تو شاید مصری جائداد سے بھی محروم ہوجاتا۔

مصطفیٰ فاضل کا لائحہ، تاریخ مشرق جدید کا ایک اہم واقعہ ہے۔ جس جرأت و صراحت کے ساتھ وقت کے ایک مستبد سلطان کو مخاطب کیا گیا ہے، اور استبداد و شخصیت کی جگہ آزادی و شوریٰ کی دعوت دی گئی

ہے، اس کی کوئی دوسری نظیر اس عہد میں نہیں مل سکتی - ہم چاہتے ہیں۔ یہ پورا الائحہ اردو میں منتقل ہو جائے، کیونکہ یہ تاریخ مشرق جدید کی ایک قیمتی دستاویز ہے

مسئلہ اصلاح اور ایک اصل مہم

یہ موقع تفصیل کا نہیں۔ لیکن اشارہ ناگزیر ہے۔ دولت عثمانیہ میں سلطان مصلح کے عہد سے لے کر سلطان عبدالحمید خاں تک اصلاح و تجدید کی جس قدر حرکتیں ظہور میں آئیں، وہ اگرچہ اس اعتبار سے قابلِ احترام ہیں۔ کہ استبداد و فساد کے مقابلہ میں حریت و اصلاح کی طلبگار تھیں، لیکن ساتھ ہی یہ واقعہ بھی یاد رکھنا چاہیے۔ کہ اُن کی بنیاد میں یورپ کی عامیانہ تقلید و محاکات کے سوا کوئی مجتہدانہ بصیرت موجود نہ تھی۔

صدیوں سے اسلام کی حقیقی دینی روح مفقود ہو چکی تھی۔ اسلام کے حقیقی سرچشمہ شرع و تعلیم کی جگہ طرح طرح کے انسانی ساخت کے نئے سرچشمے پھوٹ نکلے تھے۔ اور اجتہاد و نظر کی جگہ تقلید و جمود کی بنیادیں استوار ہو گئیں تھیں۔ ضرورت تھی۔ کہ ایسے اصحاب نظر و بصیرت پیدا ہوتے، جو سب سے پہلے اُمت کے دینی مزاج کی درستگی کی کوشش کرتے جس کے بغیر حکومتوں کا حاکمانہ مزاج بھی درست نہیں ہو سکتا تھا۔ اس اصلاح کے بعد یورپ کے علمی و صناعی فوائد کے اخذ و اختیار کی راہ خود بخود کھل جاتی ہے۔ البتہ بصیرت و اعتبار کے ساتھ کھلتی۔ تقلید و کورچشمی کے ساتھ نہ کھلتی۔ لیکن افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ دولت عثمانیہ میں ایسے علماء ناپید تھے۔ اور ہمیشہ

ناپید ہے۔ جو صاحب نظر و بصیرت ہوں۔ امراء و حکام جہل و اوہام کی تاریکی میں گم تھے۔ اتفاقات نے چند شخصیتیں پیدا کر دیں۔ جنہیں یورپ کے علوم و لغات سے آشنا ہونے کا موقعہ مل گیا۔ یہ اپنی کسی بصیرت و روشنی کی بنا پر نہیں۔ بلکہ محض تقلید کی راہ سے استبداد و جہل کی مضرتوں پر مطلع ہوئے۔ اور اصلاح و انقلاب کی سعی شروع کر دی۔ سعی صحیح تھی، بروقت تھی، لیکن ساعی بصیرت و نظر سے محروم تھے۔ مرض کا احساس غلط نہ تھا، لیکن نہ تو تشخیص کامل تھی۔ نہ علاج ہی صحیح تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس راہ میں جس قدر قدم بھی اُٹھے، وہ اگرچہ اکثر حالتوں میں اصلاً غلط نہ تھے، لیکن مجتہدانہ بصیرت و نظر کے فقدان سے کوئی صحیح انقلاب صورت حال میں پیدا نہ کر سکے، اور شرح اس اجمال کی بہت طولانی ہے۔

بہرحال بحث و نظر کا یہ مقام دوسرا ہے۔ اس کے فہم و ذوق کے لئے دوسری قسم کی صحبتیں مطلوب ہیں۔ یہاں جو حقیقت قلمبند کرنی ہے کہ گذشتہ صدی کے مشرقی مصلحین کی تاریخ میں مصطفےٰ فاضل پاشا کو اصلاح و انقلاب ترکیہ کے بانی و داعی ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اور اس کا یادگار کارنامہ "لائحہ اصلاحیہ" ہے

مصطفےٰ فاضل کا لائحہ

اعلیٰ حضرت :-

کلمۂ حق بادشاہوں اور حکمرانوں تک پہنچنا، بہت مشکل ہے۔ درباری اُس پہ پردہ ڈالتے۔ اور اُسے چھپاتے ہیں۔ بادشاہ فرمانروائی کے نشہ میں مخمور اور سلطنت کی لذتوں میں غرق، راہ صواب سے غافل ہو جاتے ہیں۔

وہ خیال کرتے ہیں۔ کہ قومیں اپنے ہی کرتوت سے پریشانی میں پڑتی ہیں۔ اور اپنی ہی غفلت سے پستی میں گرتی ہیں۔ سلطنتیں، جب برباد ہوتی ہیں تو قضاؤ قدر کے بے روک ہاتھوں ہی سے برباد ہوتی ہیں،

واقعات کو رو در رو دیکھنے اور اوہام کو اوہام سمجھنے کے لئے انسان کو بڑے ہی خلاص اور بڑی ہی جرأت کی ضرورت ہے۔ بادشاہ تک بےکم و کاست حقیقت پہنچانے کے لیئے اور بھی زیادہ اخلاص و جرأت کی ضرورت ہے۔

میرے آقا! یہ اخلاص کبھی میرے دل سے جُدا نہیں ہوا۔ خود اعلیٰ حضرت سلطان اِس کے شاہد ہیں۔ وہ لوگ بھی اس سے ناواقف نہیں۔ جو میری جلاوطنی کا سبب ہوئے ہیں۔ بلاشبہ زمانے نے مجھے موقع نہیں دیا کہ روشن کارناموں سے اعلیحضرت کی ذات شاہانہ سے اپنی عقیدت ثابت کرتا اور اپنی قوم کی فلاح و بہبود ـــــ اگر یہ نہ کہوں۔ کہ اُس کے احیا کے ارادے پورے کر سکتا۔ لیکن مَیں پہلا آدمی ہوں۔ جس نے اعلیحضرت کے سامنے شاہی حکومت کے عیوب بے پردہ کرنے۔ اور وطن عزیز کے مصائب پیش کرنے کی جرأت کی ہے۔ یہ اس لیئے۔ کہ میرا دماغ اعلیحضرت اور سلطنتِ عثمانیہ کی خدمت کے لئے سراسر وقف ہے۔ مجھے اعلیحضرت

کے عرش سے جو عقیدت و وابستگی ہے۔ اور وطن محبوب سے جو محبت و وارفتگی ہے، اُس نے مجھ میں یہ قوت پیدا کر دی ہے۔ کہ بے خوف و خطر اُن مصائب و آلام پر نظر ڈالوں۔ جو ہمیں رات کی تاریکی اور دن کی روشنی میں پیش آرہے ہیں۔ حضور کے اخلاق عالیہ پر میرا یقین مجھے ہمت دلاتا ہے۔ کہ اُن مصائب کی تشریح کر دوں۔ کوئی ایک بھی مخفی نہ رکھوں۔ سب کو صاف صاف ظاہر کر دوں۔ پھر وہ علاج عرض کر دوں۔ جو ہمیں شفا بخش سکتا ہے، بشرطیکہ اُس کے استعمال سے پہلے وقت نکل نہ جائے۔

میرے آقا! آپ کی مسیحی رعایا کی جانب سے جس سرکشی کا برابر اظہار ہوتا رہتا ہے، وہ یقیناً ہمارے اجنبی دشمنوں کی شرارت کا نتیجہ ہے لیکن وہ اِس امر کی بھی دلیل ہے۔ کہ اعلیٰ حضرت کی حکومت کا برتاؤ اپنی تمام رعایا کے ساتھ کوئی عمدہ برتاؤ نہیں ہے۔ اِس برتاؤ میں اگر حکومت پہلے معذور تھی۔ تو یقیناً اب اُسے برقرار رکھنے میں اُس کے لئے کوئی عذر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس مسلک کا ثمرہ ظلم کے سوا کچھ نہیں ہے جہل، اُس سے پھیلتا ہے، فقر و فاقہ اور شر و فساد کی اُس سے پیدائش ہوتی ہے۔

یورپ خیال کرتا ہے۔ کہ سلطنتِ عثمانیہ میں صرف مسیحی رعایا ہی ظلم و تذلیل کے لئے منتخب کر لی گئی ہے۔ حالانکہ یہ سخت غلطی ہے مسلمان جن کی حمایت پر کوئی یورپین سلطنت نہیں، مسیحیوں سے زیادہ ظلم

اُٹھا رہے ہیں۔ اُن کے مصائب و آلام کہیں زیادہ ہیں۔ وہ اب تک محض اِس لئے صبر کئے بیٹھے ہیں۔ کہ قضاء و قدر پر اُن کا پختہ ایمان ہے۔ صبر و سکون کے عادی ہیں۔ نفس بلند رکھتے ہیں۔ اُن کی یہ صفات، یورپین تخیل سے بہت بلند ہیں۔ اِس لئے یورپ والے اُنہیں سمجھ نہیں سکتے۔ پھر یہ مسلمان، اُن شریف اور اولوالعزم اسلاف کی نسل ہیں۔ جو فرمانروائی کے تخت پر جلوہ گر ہو چکے ہیں۔ سلطنت سے اُن کا اخلاص، قرآن پر اُن کے ایمان سے مل کر ایسا راسخ ہو گیا ہے۔ کہ اب تک اُس میں تزلزل پیدا نہیں ہوا۔ لیکن اعلیٰحضرت اپنے مخلص ترین خادم کو یہ عرض کرنے کی اجازت دیں۔ کہ اب مسلمانوں کا بھی پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا ہے۔ مصیبت آخری حد تک پہنچ چکی ہے۔ آلام نے اُن کا جسم کھا ڈالا ہے۔ اپنا غم و غصہ چھپانے کی اب اُن میں قدرت باقی نہیں رہی۔ یقیناً حضور والا کے خاندان اور قوم کے لئے یہ سخت خطرہ ہے۔ کہ رعایا، یاس و ناامیدی کا شکار ہو جائے۔

مخلوق پر ظلم بہت سخت ہو گیا ہے۔ آپ یقیناً اُس سے متنفر ہیں، اور میں یقین کرتا ہوں۔ کہ آپ کی اُمت کے عظماء و اکابر بھی اُس سے بیزار ہیں۔ لیکن وہ مجموعی حکومت کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔ حتیٰ کہ خود اعلیٰحضرت بھی، جن کی قوت معلوم اور سطوت مشہور ہے۔ شاید اُسے روکنے کی قدرت نہیں رکھتے۔ کیونکہ اُس کی خبر سمع مبارک تک پہنچتی ہی نہیں۔ حالانکہ وہ اس اُمت کی مردانگی تباہ کر رہا ہے۔ اُس کی شخصیت گرا رہا ہے۔ اُس کے فضائل برباد کر رہا ہے۔

میرے آقا! آپ کی رعایا میں ایسے مخلص افراد موجود ہیں۔ جن کے دل یہ دیکھ کر حسرت سے پگھلے جاتے ہیں۔ کہ یہ امت ۔ ۔ ۔ جو ہماری عزت و فخر ہے۔ کس طرح نسل کی کمی اور ہجرت کی زیادتی کی وجہ سے کمزور و کم تعداد ہوتی چلی جا رہی ہے۔ لیکن میں اس سے خائف نہیں ہوں۔ ممکن ہے۔ اس میں ہمارے فوجی نظام کو بھی کچھ دخل ہو۔ لیکن جس چیز سے میں ڈرتا ہوں اور جسے روز بروز قریب آتے دیکھتا ہوں، وہ یہ ہے۔ کہ ہم مغلوب قوموں کے مشابہ ہوتے جاتے ہیں۔ روز بروز ہماری معنویت کمزور ہو رہی ہے اور یہ مرض قوم کے تمام طبقوں میں عام ہوتا جاتا ہے۔

میرے آقا! ہمارے اسلاف نے چار صدی پہلے مشرق کی رومن شہنشاہت تہ و بالا کر ڈالی، عروس البلاد اور ملکۂ جہاں قسطنطنیہ میں اپنے قدم گاڑ دیے اور وہ فتح عظیم حاصل کی، جو تاریخ میں ایک عظیم ترین کارنامہ شمار کی جاتی ہے۔ لیکن اس حیرت انگیز کامیابی کا راز کیا تھا؟ صرف دین کا اعتقاد اور جنگ میں شجاعت ہی نہ تھی۔ اُن کی وہ اولوالعزمی اور بہادری، درحقیقت اُن کی معنویت ہی کا ایک جلوہ تھا۔ وہ اپنے سرداروں کی اطاعت، خوش دلی سے کرتے تھے، نہ کہ خوف اور مجبوری سے۔ یہی وہ تھی۔ کہ ذلت اُن پر قابو نہ پا سکی۔ عقل پر اندھی تابعداری غالب نہ آ سکی۔ اُن کی خودداری برابر باقی رہی۔ استقلالِ ذاتی نے اُن کا ساتھ نہ چھوڑا۔ اطاعت نظام (ڈسپلن) کی روح، عزت نفس کی روح سے مل گئی تھی۔ دونوں روحیں، مضبوط اخلاق کی بنیادوں پر قائم تھیں۔ فضیلت نے اُن میں گھر کر لیا تھا۔

اس لئے انہوں نے وہ عظیم سلطنت اُلٹ ڈالی ۔ جسے استبداد کی زندگیتیں گھن کی طرح لگ گئی تھیں ۔ اور ظلم و جور نے اس کی تمام چولیں ہلا ڈالی تھیں۔
بلاشبہ مضبوط اخلاق ہی اس وجود میں تنہا ایک قوت نہیں ہے ۔ کیونکہ یہاں جرائم کی بھی جرار فوجیں کھڑی ہیں ، اور گناہوں کے تخت بھی بچھے ہیں۔ لیکن یہ یقینی ہے ۔ کہ مضبوط اخلاق ، ایک مستحکم و راسخ بنیاد ضرور ہے ۔ اُس کے بغیر کوئی سلطنت قائم نہیں ہو سکتی ۔ جب وہ کسی قوم کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے تو اُس قوم کی اجتماعی عمارت بھی گر پڑتی ہے ۔ اس کا یہ خاصہ عجیب ہے ۔ کہ جوں جوں اُس کی فتوحات میں وسعت ہوتی ہے ، اُس کا دائرہ بھی وسیع و عظیم ہوتا جاتا ہے ۔ برخلاف دوسری قوموں کے جو امتدادِ زمانہ سے کمزور ہو جاتیں اور کامیابی کے بعد فنا ہونے لگتی ہیں ۔
اعلیٰ حضرت کی عظمت اور وطن کی عزت کے تمام خیر خواہ ، انتہائی رنج و ملال سے دیکھ رہے ہیں ۔ کہ قوم کی شہامت ، زائل ہو رہی ہے ۔ اور اُس کی شرافت و خود داری ختم ہوتی جاتی ہے ۔ یہ اعلیٰ صفات ، قوم میں کیونکر باقی رہ سکتی ہیں اگرچہ کتنی ہی راسخ ہوں ، جبکہ مسیحی رعایا کے ساتھ مسلمان بھی گوناگوں ذلتوں کا نشانہ بنتے ہوتے ہیں ۔ اور ہر قسم کی دنایت کے گھونٹ انہیں زبردستی پلائے جا رہے ہیں ۔ مسلمان اور عیسائی ، حضور والا کی تمام رعایا ، حکام کے ظلم و جور سے چیخ رہی ہے ۔ یہ حکام وہ ہیں ۔ جو حضور کے برائے نام فرمانبردار ہیں ۔ اعلیٰ حضرت کو کیا معلوم ۔ کہ وہ شاہی احکام قوم میں جاری کرتے ہیں ۔ یا اپنی ہوا و ہوس سے کام لیتے ہیں !

آپ کی سلطنت، عام رائے سے خالی ہے۔ نتیجہ یہ ہے۔ کہ آپ کے عمال، رعایا کے سامنے جواب دہ نہیں ہیں اس کے معنی یہ ہیں۔ کہ خود حضور کے عرش معلیٰ کے روبرو بھی ذمہ دار اور جواب دہ نہیں ہیں کیونکہ کوئی شخص بھی اُن کی شکایت عتبات عالیہ تک پہنچانے کی قدرت نہیں رکھتا، اور چونکہ اُن کے جرائم ذات شاہانہ کے علم میں نہیں آ سکتے، اس لیئے اُن سے بازپرس بھی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا وہ بالکل نڈر ہو گئے ہیں رعیت پر دست درازی میں بے باک ہیں۔ ہر قسم کی برائیاں کھلے بندھوں کر رہے ہیں۔ باشندے دو گروہوں پہ منقسم ہو گئے ہیں۔ ظالم حاکم، کوئی نہیں جو اُن کا ہاتھ پکڑ لے۔ مظلوم رعایا، کوئی نہیں جو اُس پر ترس کھائے۔ حاکم جس کا دعویٰ ہے۔ کہ اُس کی قوت، خود سلطان کی قوت ہے، لہٰذا بے روک اور بے قید ہے۔ وہ اِس وقت کی گھمنڈ میں جملہ مصائب و نقائص سے آلودہ ہوتا ہے۔ محکوم، جس کا کام یہ رہ گیا ہے۔ کہ ذلت کے تاریک غار میں برابر گرتا چلا جائے، حکام، جنہوں نے رعایا کے لبوں پہ قفل چڑھا دیئے ہیں اگر کبھی کسی کے منہ سے فریاد کی چیخ بلند ہو جاتی ہے تو یہ حکام اُسے بغاوت قرار دے دیتے ہیں۔ لہٰذا تمام رعایا، ناامیدی میں پڑ گئی ہے۔ بے حساب ظلم و جور کے نیچے دبی ہے، مگر خوف سے چپ ہے ظلم کے ہاتھ اُس کا گلا دابے ہوئے ہیں۔ اور اعلیٰ حضرت سے مخفی نہیں کہ ظلم دلوں میں فساد پیدا کر دیتا اور عقلوں میں فتور ڈال دیتا ہے ؏

ترکوں کی رگوں میں پاک اور بے میل خون موجزن ہے۔ یقیناً ہر وطن سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ حب الوطنی، ہماری ہمتیں بلند کرتی ہے، بڑی سے بڑی قربانیاں بھی ہم پہ آسان کر دیتی ہے۔ ہم بہادر سپاہی ہیں، موت سے نہیں ڈرتے۔ ہم میں وقار ہے۔ اور ہمارے اسلاف سے ہمیں میراث میں ملا ہے۔ ہمارا امتیازی وصف، صریح اخلاص ہے یہی اخلاص ہمیں آمادہ کرتا ہے کہ مساوات کو جملہ محاسن پر ترجیح دیں۔ لیکن کیا یہ صفات حمیدہ ہم میں زیادہ مدت تک باقی رہیں گی؟ کیا ہم خیر و شر کے اس تصادم کا ہمیشہ یونہی مقابلہ کرتے رہیں گے؟

میرے آقا! جس دن یہ اخلاق ہم سے رخصت ہو جائیں گے، اسی دن ہماری موت بھی نازل ہو جائے گی۔ ہم کسی کو بھی اپنا حامی و مددگار نہ پائیں گے۔

کاش ہماری مصیبت، صرف ہمارے معنوی انحطاط ہی پر ختم ہو جاتی اور اس جہل عمیم اور فساد عظیم تک نہ پہنچتی جو ہمارے تمام عقلی قویٰ تباہ کر رہا ہے۔

میرے آقا! جب ہمارے اسلاف یورپ میں اترے، تو ان کے پاس علم کی کوئی روشنی بھی نہ تھی لیکن وہ ذوق سلیم رکھتے تھے۔ یہ ذوق انہیں قوت و جرأت پیدا کرتا تھا، جیسا کہ تمام پاک اور بلند نفسوں کا خاصہ ہے وہ علم نہیں رکھتے تھے، مگر عقل کے مالک تھے۔ وہ عقل جو حرکت پسند کرتی، جمود سے نفرت کرتی، اور رذالت سے کراہت رکھتی ہے۔ وہ ان لوگوں

سے بالکل مختلف تھے۔ جو ہمارے ہراول دیکھتے ہی بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ وائے افسوس! عثمانیس، اس حکومت کے زیر سایہ مفلوج ہو جاتی ہیں۔ جس میں انفرادی ہمت کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہوتی!

میرے آقا! آپ کی رعایا میں ترک سب سے زیادہ استبداد سے ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ استبداد اُن کی فطری استقامت نفس اور خودداری سے میل نہیں کھاتا۔ ہم ترکوں میں وہ شرمناک قابلیت ذرا بھی موجود نہیں جو بیزنطینی عیسائیوں میں تھی۔ اُن کی حالت یہ تھی۔ کہ عقل و فطنت رکھتے تھے مگر نہ ذلت سے گریز کرتے تھے۔ نہ مطلق العنان حکومت سے نفرت رکھتے تھے ہم بالکل سادہ دل پیدا ہوتے تھے۔ ہمارے خیالات کی سادگی پر دنیا کو حیرت تھی۔ لیکن جب ہمارے خیالات ہم سے چھین لئے گئے۔ تو ہم مخبوط الحواس ہو گئے۔ عقل کی نعمت سے محروم ہو گئے۔ اگر یہی حالت جاری رہی۔ تو ایک دن آئے گا۔ جب ہم میں حکمرانی کی صلاحیت باقی نہ رہے گی۔ کوئی ایک آدمی بھی ایسا نہ ملے گا جو انتظام سنبھال سکے۔

حضور والا! ہم اب ایک ایسے زمانے میں ہیں جس میں عزت اُسی کو مل سکتی ہے جس کی عقل بڑی اور علم زیادہ ہو۔ یہی باعث ہے کہ تمام یورپ میں علم کا غلغلہ بلند ہے۔ اور تمام قوتیں اُس پر صرف ہو رہی ہیں۔ کوئی حکومت بھی اس کے ذکر و اہتمام سے خالی نہیں ہے۔ سوئٹزرلینڈ میں ایک آدمی بھی اَن پڑھ دکھائی نہیں دیتا۔ انگلستان میں جس پر مٹھی بھر امراء حکومت کرتے تھے۔ مگر اب اپنے امتیازات سے دست بردار ہوتے

جاتے ہیں) ۲۵ برس سے اشاعت تعلیم کی عظیم الشان کوششیں ہو رہی ہیں۔ مجھے یقین ہے۔ کہ پروشیا نے آسٹریا پر صرف اس سبب سے فتح پائی ہے کہ وہ مغلوب سے علم میں زیادہ تھی۔ کیا ہمارے لئے روا ہے۔ کہ اپنے عقلی انحطاط پر قانع رہیں، حالانکہ ہمارے گرد یورپ عقلی ارتقار کے لئے آن تھک کوششیں کر رہا ہے؟

میں اس خیال سے پناہ مانگتا ہوں۔ کہ اعلیٰ حضرت اشاعت تعلیم کے لئے صرف مدارس کی کثرت کافی تصور فرمائیں۔ وہ محل کس کام کے جنہیں مکین نہ ملیں؟ اُن مدارس سے کیا فائدہ جن میں ذلت و خواری کی اولاد تربیت پلئے؟

میرے آقا! اہل یورپ کہتے ہیں۔ کہ ہماری کمزوری اور انحطاط ہماری قومیت اور ہمارے دین کی وجہ سے ہے۔ نیز کہتے ہیں۔ کہ ہم فوجی زندگی بسر کرنے کے علاوہ اور کسی بات کے لئے موزوں ہی نہیں۔ حالانکہ ان کا یہ خیال حقیقت سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ ہماری امت دُنیا کی دوسری امتوں سے کوئی مستثنےٰ صورت حال نہیں رکھتی۔ جس طرح دُنیا کی مختلف قومیں ابتداً میں جنگی قوت سے نمایاں ہوئیں، تاکہ اپنی ہستی کے لئے استقلال پیدا کریں، اور پھر علوم و صنائع اور تمام اعمال کی طرف قدم نہ بڑھائیں۔ قوم کی ابتدائی حرکت لڑائی میں ظاہر ہوتی ہو۔ یا صنائع میں، مصدر دونوں کا ایک ہی ہوتا ہے۔ اور وہ حرکت کی استعداد ہے۔ جس میں یہ استعداد ہے۔ اس کی راہ کبھی رُک نہیں سکتی۔ خود یورپ کی مختلف قوموں کا اٹھان ہماری ہی طرح جنگ و عسکریت سے ہوا ہے۔ اور اب وہ تمدن و صنائع کے میدان میں سب سے پیش پیش ہیں۔

ہیں۔

اسی طرح ہمارے دین پر بھی الزام، صحیح نہیں۔ اس دین کی طرح دُنیا کے تمام دینوں کی بھی تعلیم یہی ہے۔ کہ جملہ کائنات، مشیئت الٰہی کے ماتحت ہے۔ مسیحیوں کے عقیدے اس بارے میں ہمارے عقیدوں سے کہیں زیادہ سخت ہیں۔ وہ مذہب جبر پر ایمان لائے ہوئے ہیں۔ اُن کے پولس رسول کی تعلیم ہے کہ انسان، پروردگار کے ہاتھ میں ایسا ہے۔ جیسے گندھی ہوئی مٹی کمہار کے ہاتھ میں ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود بھی اے میرے آقا! اُنہیں بھلائی اور بہتری حاصل کرنے سے کوئی چیز روک نہ سکی۔

حق کا اظہار ضروری ہے۔ ہمیں جس چیز نے اُن کی طرح عملی قوم ہونے سے روک دیا ہے، وہ ہمارا طرزِ حکومت ہے۔ جس حکومت میں یہ اندھیر روا ہو۔ کہ انسان، دوسرے انسان کی محنت سے بغیر استحقاق کے نفع اُٹھائے وہاں نہ عقل ترقی پا سکتی ہے، نہ خوشحالی، عام ہو سکتی ہے۔ جس ملک میں بھی ظلم چھا جاتا ہے، مخلوق، عمل سے کنارہ کش ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اُسے اپنی محنت سے متمتع ہونے کا یقین نہیں ہوتا۔

فرانس کی حالت ہمارے سامنے ہے۔ یہ خوبصورت ملک، جس کے مداح اعلیحضرت بھی ہیں۔ ۱۷۸۹ء سے پہلے سخت غفلت و فلاکت میں پڑا تھا لائق سے لائق وزیر برسرِ حکومت آئے۔ اور بڑی بڑی کوششیں کیں۔ کہ صنعت و حرفت اور تجارت و زراعت رواج دیں، ملک میں حرکت و زندگی پیدا کریں مگر ناکام رہے۔ ملک نے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھایا۔ اُس

وقت حالت یہ تھی کہ ظلم و استبداد ہر طرف چھایا ہوا تھا۔ رعایا اپنی محنت سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتی تھی۔ کسان جنگلوں میں مارے مارے پھرتے تھے۔ فقر و فاقہ نے اُنہیں حیوانوں کی سی مخلوق بنا دیا تھا۔ کوئی بھی محنت و مشقت کی طرف رغبت ظاہر نہیں کرتا تھا۔

لیکن صرف تین برس کی مدت کے بعد اب فرانس، فرانس ہو گیا ہے تمدن و تہذیب کا مرکز ہے۔ علوم و صنائع سے مالا مال ہے۔ میرے آقا! یہ حیرت انگیز تبدیلی، صرف انتظام حکومت کی تبدیلی کا نتیجہ تھی۔ مستبد حکومت نے ملک کو ویران کر ڈالا تھا۔ آزاد حکومت نے آتے ہی اُس میں روح پھونک دی۔ ایسی روح جس نے اُسے زندہ، جوان، طاقتور، اور خوشحال بنا دیا۔ درحقیقت فرانس پر آزادی کا بہت ہی عظیم احسان ہے۔

میرے آقا! آزادی، قوموں کو زندہ کر دیتی ہے۔ صرف معنوی زندگی ہی نہیں۔ مادی زندگی بھی بخشتی ہے۔ جب انسان اپنے حقوق سے محروم ہو جاتا ہے۔ تو ناکارہ ہو جاتا ہے۔ اُس کے تمام جسمانی و معنوی قویٰ معطل ہو جاتے ہیں۔

میرے آقا! جب قوم کی وہ حالت ہو جائے، جو اوپر عرض کر چکا ہوں۔ زمانہ، اُس کے اخلاق پر دست درازی کرے، غفلت، آہستہ آہستہ اُس کی عقل پر حاوی ہوتی جائے، فقر و فاقہ اُس کا خون چوسنے لگے، اور سلطنت کے خزانے خالی ہو جائیں۔ تو ایسی حالت میں ہر محب وطن اور مخلص قوم کا فرض ہو جاتا ہے۔ کہ صرف اصلاح کے مطالبہ ہی پر قانع

نہ ہو جائے۔ بلکہ عمل کا ذرا قدم بھی اُٹھتا ہے۔ اصلاح ایک بے معنی لفظ ہے اگر اُس کے ساتھ عمل نہ ہو سکے۔ قوانین کا ہم سے وعدہ کیا گیا، کتنے نظام شائع کئے گئے، مگر کبھی عمل سامنے نہیں آیا۔ لہذا اب ہم پر فرض ہو گیا ہے۔ کہ ایک قدم آگے بڑھیں۔ اور یہ اہم معروضہ عرش معظم کے روبرو انتہائی تعظیم و احترام کے ساتھ پیش کر دیں۔

میرے آقا! آپ اِس سلطنت کا ہاتھ پکڑیئے اور اُس کا شباب تازہ کر دیجئے۔ دستور (یعنی دستوری نظام حکومت) کا ہاتھ بڑھائیے۔ اور اُسے اختلال و بدنظمی سے نکال لیجئے۔ امت کو ایسا دستور بخشئے، جس کا جسم تندرست ہو، سینہ کشادہ ہو، نیت نیک ہو۔ پھر اُسے اپنی امان میں لے لیجئے، ایسا انتظام قائم کیجئے۔ کہ وہ اخلاص سے جاری ہو۔ امانت سے اُس پر عمل کیا جائے، اور ہمیشہ کے لئے دست درازیوں سے محفوظ ہو جائے۔ ایسا دستور جس کے سامنے مسلم اور غیر مسلم، دونوں اپنے حقوق و واجبات میں برابر ہوں، تاکہ قومی اتحاد پیدا ہو۔ سب کو سلامتی اپنے سایہ میں لے لے، اور مغربیوں کا یہ کلیہ ٹوٹ جائے کہ "غالب اور مغلوب میں اتحاد، محال ہے"۔

آہ میرے آقا! میں دیکھتا ہوں۔ کہ ہمارے اہل حل وعقد میں منافق اور جاہل، لفظ دستور تک سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اعلیحضرت سے کہتے ہیں۔ کہ دستور بادشاہ کو ایک بے جان کٹھ پتلی بنا دیتا ہے۔ اس کا اختیار چھین لیتا ہے۔ اس کی عظمت سلب کر لیتا ہے دوسری طرف قوم سے کہتے ہیں:۔ دستور تمہیں تمہاری عزیز ترین خصوصیتوں: دین،

لباس، رسم و رواج سب سے محروم کر دے گا۔ لیکن یہ لوگ یا تو دغا باز ہیں، یا جہالت نے اُن کی عقل پر پردے ڈال دئے ہیں

میرے آقا! ان لوگوں کے مشورے پر کان نہ دھریئے۔ اے میری اُمّت! ان کی گمراہی کی پروا نہ کر۔ دستور، صرف خودغرضی کو روکتا ہے پادشاہ کی صرف اتنی ہی آزادی سلب کرتا ہے۔ کہ وہ رعیت کے معاملہ میں غلطی نہ کرے۔ اتنا ہی اختیار چھینتا ہے۔ جتنے غیرمعتدل اختیار سے شر پیدا ہوتا ہے۔ وہ قوم پر کوئی ایسا حکم نہیں لگاتا۔ جو اُس کی عزت کے خلاف یا اُس کی سعادت کے منافی ہو۔ وہ دین کی حفاظت کرتا ہے۔ سلطنت کا نگہبان ہوتا ہے۔ حقوق کی ضمانت کرتا ہے۔ دلوں میں اطمینان اُتارتا ہے ہر انسان کو آزاد اور شریف بنا دیتا ہے!

دستور ہمارے لئے یہ موقعہ بہم پہنچائے گا۔ کہ تمام سلطنتوں سے اپنے تعلقات اور زیادہ بہتر بنا دیں۔ یہاں، اس ملک میں، وہاں، یورپ میں، کون نہیں جانتا۔ کہ ہمارے معاملات میں سفراء و دول کی مداخلت نے کتنا نقصان پہنچایا ہے؟ یہ لوگ برابر اصلاح، اصلاح چلاتے۔ مگر سب کو معلوم ہے۔ کہ اس مطالبہ سے اُن کا مقصود ایک قوم کو دوسری قوم پر ترجیح دینا ہے۔ یا اس سے اُن کی غرض بعض افراد کی خدمت ہے یہ اور بھی زیادہ بُرا اور نقصان دہ ہے۔ لیکن دستور، ہماری حکومت کو ایسی مستحکم بنیادوں پر قائم کر دے گا۔ کہ کسی اجنبی کو مداخلت کی جرأت باقی نہ رہے گی۔ تمام رعایا اپنی حکومت کے ظلِ حمایت میں ہوگی۔ سب کو

عدل و انصاف کے سایہ میں یکساں امن ملے گا۔ دستور کے سامنے سب آدمی برابر برابر ہو جائیں گے۔

میرے آقا! وقت آگیا ہے۔ کہ اسلاف کی سلطنت کو آپ بچائیں اسی کی راہ میں ہمارے خون اور ہمارے آنسوؤں کی قربانیاں عظیم تھیں اس کا ماضی، شاندار تھا، اس کا حاضر، حسرتناک ہے۔ آہ، یہ حاضر خود اعلیحضرت کے رحیم قلب کے لیئے کیسا؟ کس درجہ تکلیف دہ ہے؟ ہمارے ہر چیز ہمیں دھمکا رہی ہے۔ ہمارے ہاتھ کی ہر چیز گرتی اور لوٹتی جاتی ہے۔ اعلیحضرت کی دوربین نظریں یہ سارے خطرے دیکھ رہی ہیں۔ معاملہ سنجیدہ اور واقعی ہے۔ خیال، تو ہم کی اس میں گنجائش نہیں۔ آپ کے پاس اتنی فوج موجود ہے۔ کہ اجنبی ایندھن سے بھڑکنے والی ہر بغاوت کی آگ بجھادے سکتی ہے۔ لیکن اس فوج کے پاس نہ تو کھانا ہے۔ کہ مفتوحین کا پیٹ پال سکے، نہ حکمت ہے۔ کہ مغلوبوں کے دلوں میں اتار سکے اور نہ ہی امان ہے۔ کہ خوفزدوں کو اپنے دائرۂ حفاظت میں لے لے۔ اور ظالموں کا ظلم روک سکے۔ آپ طماعوں کو اپنے ملک میں نئے نئے امتیازات دے دے کر فیصلہ کا دن دور کر سکتے ہیں۔ لیکن آپ کی اس بخشش میں ہمارا حصہ کیا ہے؟ بہت ممکن ہے۔ فیصلہ کے ہولناک دن میں ہم اسی بخشش کی بدولت اور بھی زیادہ کمزور، بےکس، اور فقیر ثابت ہوں۔

میرے آقا! ہر سال جو گزرتا ہے، ہمارے بیرونی مددگاروں کی

تعداد کم کرتا اور ہماری داخلی زندگی کا ایک چراغ بجھا دیتا ہے۔ یہ انگلستان ہمارے سامنے موجود ہے۔ اب وہ ہماری امداد کا ویسا خواہشمند نہیں رہا جیسا بارہ[12] برس پہلے تھا۔ یہ آسٹریلیا جرمنی سے شکست کھانے کے بعد اب مغربی ہونے سے زیادہ مشرقی سلطنت بن گیا ہے۔ اب وہ سلادی قوموں سے نفرت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جو ہماری سرزمین میں مقیم ہیں اس سے بھی زیادہ اندیشہ کی بات یہ ہے۔ کہ یورپ کی عام رائے ہمارے برخلاف ہوگئی ہے۔ ۱۸۵۵ء میں وہ ہماری طرفدار تھی، مگر روز بروز ہم سے منہ پھیرتی جاتی ہے۔ اگر اعلیحضرت مہربانی فرماکر پیرس، لندن اور روم کے اخبارات پر ایک نظر ڈالیں۔ تو معلوم ہو جائے گا۔ کہ جو قومیں اپنی مصلحت سے ہماری مدد کیا کرتی تھیں، اب وہ ہماری تباہی کا یقین کرنے لگی ہیں انگلستان، فرانس اور اٹلی کے بہت سے مدبر ہمارے حکام کی حرکتیں دیکھ کر اور رعایا پر ظلم و ستم مشاہدہ کرکے اپنی تحریروں اور تقریروں میں اعلان کرنے لگے ہیں ؎۔ یہ حکومت ہرگز اپنی اصلاح نہیں کر سکتی۔ اُس کا زوال یقینی ہے۔ ہم بھی اُسے چھوڑ دیں۔ اس کی موت جلد واقع ہو جانے دیں!"

میرے آقا! ہمیں ان پیشینگوئیوں کی تکذیب کر دینی چاہئے لیکن یہ اُسی وقت ممکن ہے۔ کہ اپنی حکومت میں تبدیلی کریں۔ یہ تبدیلی ضرور بہتر ہوگی، کیونکہ اعلیحضرت کے ارادے اور حکم سے ہوگی۔ ہم فرانس انگلستان اور اٹلی پر ثابت کر دیں۔ کہ نہ ہماری قومیت نے ہمیں اس کمزوری اور

فساد میں گرا رکھا ہے؛ نہ یہ ہمارے مقدس دین ہی کا اقتضا ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ ہم مر چکے ہیں! ہم زندوں کی طرح عمل کر کے دکھا دیں۔ کہ نہیں، مرے نہیں ہیں، زندہ ہیں!

میرے آقا! ہم پہلی قوم نہیں ہیں۔ جس پہ زمانے نے یورش کی ہے۔ اُس کی ہر خوبی بگاڑ ڈالی ہے۔ اور اُس کے تمام قویٰ کمزور کر ڈالے ہیں۔ ہم آخری قوم بھی نہیں ہونگے جس کی ایسی زبوں حالت ہوئی ہے۔ یورپ میں بھی بہت سی ایسی قومیں ہیں۔ جن پہ زمانہ اپنی تمام مصیبتوں کے ساتھ لوٹ پڑا ہے۔ اور اُن کا حال بھی بالکل ہمارے جیسا ہو گیا ہے۔ میں اعلیٰحضرت کے روبرو عرض کر چکا ہوں۔ کہ گذشتہ صدی میں فرانسیسی قوم کس قدر تباہ ہو گئی تھی۔ کس طرح اس کی صنعت و حرفت برباد ہو گئی تھی۔ کس درجہ اُس کی ثروت کمزور ہو گئی تھی۔ کہ ہر دس سال کے بعد دیوالیہ ہو جایا کرتی تھی۔ کس طرح اُس کے تمام طبقوں پر ظلم ہو رہا تھا، حتیٰ کہ اُس وقت کے ایک مدبر نے لوئی پانزدہم سے کہہ دیا تھا:" آپ کی سلطنت میں کوئی نہیں۔ جو اپنی عزت پر فخر کرے۔ اور وزیر کے انتقام سے بچ جائے۔ کوئی نہیں جو اپنی بدحالی پر صبر و شکر کرے۔ اور ایک حقیر چپڑاسی کے غصہ سے بھی بچ نکلے!" اُس ملک میں حکومت کا کوئی رعب و دبدبہ باقی نہ رہا تھا اُس کے سامنے عمل کی تمام راہیں بند ہو گئی تھیں۔ حواس گم ہو گئے تھے روز ایک نئی روش اختیار کرتی اور بدلتی تھی۔ جنگ ہفت سالہ کے بعد تو فرانس گر کر تیسرے درجے کی دوَل کے زمرے میں شمار ہونے لگا تھا لیکن اُس

نے پھر بہت جلد اپنی اصلی جگہ حاصل کر لی۔ چند ہی سال میں اُس کی تمام برباد قوتیں واپس آ گئیں۔ حتیٰ کہ اُس کی فوجوں نے پورے یورپ کی متحدہ یلغار روک دی۔

یہ حیرت انگیز کامیابی فرانس نے کیونکر حاصل کی؟ صرف اس وجہ سے کہ اُس نے حکومت کے بوسیدہ نظام کی جگہ ایک نیا روح پرور نظام قائم کر دیا تھا۔ بلاشبہ یہ شاندار تبدیلی مصائب سے خالی نہ تھی۔ بہت سا خون بہا، بہت سے آنسو گرے مگر یہ مصائب کچھ اس تبدیلی کا لازمی نتیجہ نہ تھیں۔ ان مصائب کی اصلی وجہ یہ تھی کہ تبدیلی اُس وقت واقع ہوئی جب اُس کے لئے ذرا بھی وقت باقی نہ رہا تھا۔ بالکل آخری لمحہ تھا۔ وہ لمحہ جس میں اگر قومیں اُٹھ پڑتی ہیں، تو اُن کا اُٹھنا بڑا ہی ہولناک ہوتا ہے۔

میرے آقا! ایک فرانسیسی قوم ہی ایسی نہیں ہے۔ جو اپنے مصائب سے صحیح سالم نکل آئی ہو۔ فرانس کے علاوہ اور بھی ایسی قومیں موجود ہیں۔

ریاست پیمونٹی (اٹلی) کے نواب نے آرزو کی۔ کہ عظیم الشان اٹالین قوم کا بادشاہ ہو جائے۔ وہ بادشاہ ہو گیا۔ کیونکر؟ اُسنے کوئی فوج جمع نہیں کی، کوئی رسالہ تیار نہیں کیا؛ اُس نے صرف یہ کیا کہ قوم کو ایک آزاد دستور حکومت بخش دیا۔ اِس بخشش کے ساتھ ہی اُس کی فتوحات شروع ہو گئیں۔ زمین کی فتوحات نہیں۔ جن پہ بھروسہ نہیں کیا جا سکتا، دلوں کی

فتوحات جو دُنیا کی حقیقی فتوحات ہیں۔ وہ پورے اٹلی کے دلوں اور عقلوں پر قابض ہوگیا مرتے وقت اُس نے تبسّم لبوں سے پیشینگوئی کی "میرے بیٹے وکٹر عمانویل کی سلطنت کا رقبہ میری ریاست کے رقبہ سے تین گنا زیادہ ہوگا" دنیا نے دیکھ لیا۔ کہ بوڑھے نواب کی پیشین گوئی بالکل حق تھی یہ کیوں ہوُا ؟ صرف اس وجہ سے کہ دانشمند حکمران نے ٹھیک وقت پر آزادی کا لفظ اپنی زبان سے کہا تھا، وہ لفظ جو اپنے تین حرفوں میں دنیا کی تمام سعادتیں اور کامرانیاں پوشیدہ رکھتا ہے!

میرے پاس اس سے بھی زیادہ روشن اور صاف مثالیں موجود ہیں اور اس کی مستحق ہیں۔ کہ اعلیٰحضرت اُن پر نظرِ غائر ڈالیں۔ لیکن مَیں اس عریضہ میں اُن سب کا ذکر نہیں کر سکتا۔ مَیں آسٹریا کا ذکر کروں جو اپنی دستوری آزادی کے سہارے وقت کے عظیم خطروں سے محفوظ گزر رہی ہے، پروشیا کا ذکر کروں۔ جو ابھی کل کی بات ہے۔ کہ اپنی تہذیب کی بدولت میدانِ جنگ سے فتحمند نکلی ہے، لیکن مجھے زیادہ بیان کی ضرورت نہیں۔ مَیں جس قدر عرض کر چکا ہوں، اعلیٰحضرت کو مطمئن کر دینے کے لئے کافی ہے۔

اعلیٰحضرت! قوموں کی آزادی اُن کا حق ہے۔ اُن کی امانت ہے اُن کا ورثہ ہے۔ اور حکومتوں کا فرض ہے۔ کہ اِس امانت کے سپرد کر دینے میں تساہل نہ کریں۔ یہ سپردگی ان کی قوت بڑھاتی ہے۔ اور انہیں ہر طرح کے خطروں سے محفوظ کر دیتی ہے۔ آج دنیا کی تمام حکومتیں اِس امانت

کی سپردگی پر مجبور ہو گئی ہیں۔ کونسی وجہ ہے۔ کہ عثمانی حکومت اِس عام اجتماعی حالت سے مستثنیٰ تصوّر کر لیا جائے؟ کیا ترکی قوم زمرۂ اقوام میں شامل نہیں ہے؟

پھر ایسا کیوں ہوا؟ کیا اِس لئے۔ کہ ہمارا دین ہمیں ترقی و سعادت سے محروم رکھتا۔ اور تمدن و شائستگی سے دُور رکھنا چاہتا ہے؟ میرا جلیل القدر آقا مجھ سے زیادہ واقف ہے۔ کہ ایک لمحہ کے لئے یہ گمان صحیح نہیں ہو سکتا۔

میرے آقا! اس دنیا میں دو سیاستیں نہیں ہیں:۔ اسلامی اور مسیحی۔ عدل ایک ہی ہے، اور سیاست اُس عدل کے سِوا کچھ نہیں۔ جو حاکم کے ہاتھ سے صادر ہوتا ہے۔

یہ ہمارا دین نہیں ہے۔ بلکہ ہمارا قدیم نظام ہے۔ جو ہمیں فنا کر رہا ہے۔ اُس نے ہمارے مدبّروں کی طبیعت بگاڑ دی۔ اور ان کی خودداری زائل کر دی۔ پھر ان مدبّروں نے سلطنت کی طبیعت بگاڑ دی اور [illegible] کی عزّت تلف ہو گئی۔ پس ہمیں یہ نظام ترک کر دینا چاہیے۔ اور اُس کی طرف کبھی لوٹنا نہیں چاہیے۔ اس نظام کے بوجھ کے نیچے اُمّت پڑی سسک رہی ہے۔ یہ نظام حملہ آور دشمن سے ہمیں کبھی پناہ نہیں دے سکتا۔ ہمیں وہ نظام اختیار کرنا چاہیئے۔ جو عدل و مساوات اور حریتِ صادقہ کا نظام ہے۔ اور جس کا خاصہ یہ ہے۔ کہ جہاں کہیں قائم ہو جاتا ہے۔ وہاں قوموں کو ہاتھ پکڑ کر اُٹھا دیتا ہے۔ اور عظمت کے محل طیار کر دیتا ہے۔

کیا ہمارے لئے یہ زیبا ہے، کہ وہ صوبے جو ابھی حال ہی میں ہم سے جدا ہوئے ہیں۔ اور جنہیں اپنے خون یا دین کے لحاظ سے ہم پر کوئی ترجیح حاصل نہیں، آزاد نظام حکومت کا خیر مقدم کریں، اور ہم پس و پیش میں پڑے رہیں؟ کیا آپ کی سلطنت میں ایسے سچے اور مخلص محب وطن موجود نہیں ہیں۔ جیسے مصر، ٹیونس، مولڈا دیا، رومانیہ، اور سردیہ میں ہیں؟ کیوں نہیں، ضرور ہیں۔ انہیں بلائیے، وہ سر کے بل دوڑ کر آئیں گے۔ ہر شہر میں رعایا کی پسند سے ایک گروہ منتخب کیجئے وہ آپ کے سامنے رعیت کے معاملات بے نقاب کر دے گا۔ اور پھر وہ راہ عمل باز ہو جائے گی۔ جس کی جانب حضور کی ابوی شفقت کا رجحان ہے۔ اس کے بعد اپنے شاہانہ ارادے سے رعایا کے نمایندوں کو اپنی سلطنت کے مرکز میں جمع کیجئے۔ وہ عرش اعظم کے روبرو رعیت کی ضرورتیں پیش کریں گے اور عتبہ عالیہ تک اس کی آرزوئیں پہنچائیں گے۔

ایک طبیب کہا کرتا تھا۔ "مجھے ایک گز کپڑا دو۔ میں تمہیں ایک شریف آدمی دے دونگا۔ اے میرے آقا! آپ بھی اپنی سرپرستی میں حقوق عطا کر کے اپنی رعایا کو محنتی، اولوالعزم، اور زندہ بنا دے سکتے ہیں۔ وہ آزادی کی بخشش پر حضور کی شکر گزار ہوگی، ظلم اٹھ جانے پر دعائیں دے گی آپ کی خدمت کے لئے اپنی جانیں قربان کرے گی۔ آپ کی، اپنی اور سلطنت کی بھلائی کے لئے کوشش کرے گی۔ اس کی عقل درست ہو جائے گی، اس کا نفس پاک ہو جائے گا، اور اس طرح وہ اسلاف کی فضیلتیں دوبارہ حاصل

کرلے گی۔ جب خطرے کا بگل بجے گا، تو وہ ہتیلیوں پر سر لے کر دوڑے گی، عرش معظم کے گرد جمع ہو جائے گی، اور اعلیٰحضرت کی نصرت میں خوش و خرم موت کا خیر مقدم بجالائے گی۔ کیونکہ وہ سمجھے گی، اُس کی تمام سعادتوں کا ضامن و سرچشمہ یہی عرش مبارک ہے۔

میں یہاں اس دستوری نظام حکومت کی تشریح کرنی نہیں چاہتا جسے میں ملک کی قابلیت، اخلاق، اور روایات کے مطابق دیکھنے کا متمنی ہوں۔ میں عنقریب یہ دستور اعلیٰحضرت کے حضور میں پیش کر دوں گا۔ اسے میں نے اور میرے رفقاء نے ترتیب دیا ہے۔

اعلیٰحضرت کے علم میں یہ حقیقت پہلے سے موجود ہے۔ کہ میں صاحب غرض نہیں ہوں۔ مجھے نہ کسی منصب کی طلب ہے۔ نہ کسی عطیئے اور بخشش کی آرزو۔ میری غرض صرف اس قدر ہے، اور میں بلند آہنگی سے اُس کا اعلان کرتا ہوں، کہ اعلیٰحضرت کے روبرو سلطنت کی عظیم اکثریت یعنی مسلمانوں اور مسیحیوں کی آرزو رکھ دوں۔ یقیناً جلاوطنی کی تمام تلخیاں مجھ پر آسان ہو جائیں گی۔ اگر ذات شاہانہ کے سامنے حقیقت عریاں پیش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

اعلیٰحضرت سلطان معظم! سب سے پہلے خود اپنے ضمیر طاہر کی طرف رجوع کیجئے۔ کہ وہ اس زمانے میں آپ کا کیا فرض بتاتا ہے، جبکہ آپ کی رعیت حیرت میں پڑ گئی ہے۔ اور پورے معنی میں تباہ ہو رہی ہے؟ یہ ایک جلیل القدر عمل ہے۔ اسے وہی انجام دے سکتا ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ نے عزم و شہامت کا وسعت عطا فرما دیا ہے۔ جو کوئی بھی یہ عمل عظیم انجام دے گا۔ تاریخ اُس کا نام

ہمیشہ یاد رکھے گی۔ اور تمام مخلوق اُس کا نام عزت و شکر گزاری کے ساتھ لیتی رہے گی!

میرے آقا! اگر زمانے نے حضور والا کو وہ شرف نہیں بخشا جو آپ کے اجداد کے حصے میں آیا تھا یعنی آپ کے ہاتھوں اس عظیم سلطنت کی بنیاد نہیں پڑی۔ تو زمانے نے یہ شرف آپ کے لئے محفوظ رکھ چھوڑا تھا۔ کہ اس سلطنت کی عظمتِ رفتہ دوبارہ واپس لانے کا کام آپ ہی کے دستِ مبارک سے انجام پائے۔ تمام ہمارے محبانِ وطن۔ بلکہ آپ کی کروڑوں مسلمان اور مسیحی رعایا کی آوازیں اس دعوت میں میری شریک ہیں۔ کہ حضور اس عملِ عظیم و اشرف کی طرف متوجہ ہوں کیونکہ اعلیٰ حضرت ہی اس کے اہل ہیں۔ یہ شرف حضور کے اسمِ گرامی کو ان عظمائے تاریخ کے بلند ناموں کی صف میں لکھ دے گا جن کی تمام مخلوق تعظیم کرتی اور جن کی عظمت کے راگ تمام قومیں گا رہی ہیں۔

مصطفیٰ فاضل ١٨٦٧ء

مدحت پاشا

ترکی اصلاح و تجدد کی تحریک سلطان محمود مصلح کے زمانے میں شروع ہوئی اور سلطان عبدالعزیز کے عہد میں مصطفٰے فاضل پاشا کے ہاتھوں اس کی پہلی جماعت کی بنیاد پڑی۔ تاہم یہ محض ابتدا تھی۔ تحریک کے قیام و ترقی کے لئے ضرورت تھی کہ کوئی ایسی اولوالعزم شخصیت نمودار ہو، جو اپنی قربانی کے خون سے اس نئی تخم ریزی کی آبیاری کر سکے۔ اصلاح و تغیر کی تحریک، اس آبیاری کے بغیر کبھی نشو و نما نہیں پا سکتی۔

ترکی اصلاح کا پہلا فکری عنصر مصطفٰے رشید کی شخصیت میں نمایاں ہوا تھا لیکن اُسے سلطان محمود اور سلطان عبدالمجید جیسے اصلاح پسند فرمانروا ملے اور اس لئے اُس کی اصلاح پسندی آزمائش کی جگہ مزید قبولیت کا باعث ہوئی۔ فواد پاشا اور عالی پاشا بھی مصلحانہ افکار رکھتے تھے، لیکن وہ کوئی عملی قدم نہ اُٹھا سکے۔ اس لئے اُن کے لئے کوئی آزمائش پیدا نہ ہو سکی مصطفٰے فاضل پاشا نے بلاشبہ نیا قدم اُٹھایا، اور "لائحہ اصلاحیہ" پیش کر کے اپنے لئے خطرات پیدا کر دیئے تاہم معاملہ اس سے آگے نہ بڑھا۔ جلاوطن ہو گیا۔ یا مصر کی حکومت و خدیویت سے محروم ہو جانا پڑا۔ پس

جہاں تک تحریک کی ابتدائی نشو و نما کا تعلق ہے، اب تک کوئی شخصیت ایسی نمایاں نہیں ہوئی تھی جسے اس راہ میں جانفروشی و قربانی کی منزل سے گزرنا پڑا ہو۔ یہ منزل ایک اولوالعزم شخصیت کے ظہور کی منتظر تھی۔ یہ اولوالعزمی مدحت پاشا کی شخصیت میں ظاہر ہو گئی۔ مدحت پاشا اس راہ کا پہلا قتیل و شہید ہے۔ اُس کے خون نے وہ آبیاری بہم پہنچا دی، جس کے بغیر یہ تخمِ انقلاب بارآور نہیں ہو سکتا!

مدحت پاشا اور عبدالحمید

سلطان عبدالحمید کی پُرفریب حکمت عملیوں نے واقعات و حقائق پر ایسے پردے ڈال دئے تھے۔ کہ مدتوں تک دُنیا کی نگاہیں دھوکا کھاتی رہیں۔ اور مدحت پاشا کی شخصیت نمایاں نہ ہو سکی۔ مدحت پاشا اور اُس کے ساتھیوں کے خلاف جب مقدمہ قائم کیا گیا، اور اُسے سلطان عبدالعزیز کے قتل کی سازش کے انکشاف سے تعبیر کیا گیا، تو دُنیا نے بغیر کسی شک کے قبول کر لیا کیونکہ نہ تو مدحت پاشا کی مصلحانہ حیثیت اور اعمال کی دُنیا کو خبر تھی۔ اور نہ ترکی میں کوئی ایسی قومی طاقت پیدا ہوئی تھی۔ جو اصلیت کا اظہار کر سکتی سر ہنری ایلیٹ (انگریزی سفیر متعینہ قسطنطنیہ) نے [illegible]ء میں جب اپنی یادداشت شائع کی، اور مدحت پاشا کو بے قصور ظاہر کیا، تو خود انگلستان میں بہت کم لوگوں نے اسے باور کیا۔ عام طور پر خیال کیا گیا۔ کہ سر ہنری اپنی ذاتی دوستی کا جو اُس میں اور مدحت پاشا میں تھی، حق ادا کر رہا ہے۔ جہاں

تک مشرقی اور اسلامی ممالک کا تعلق ہے۔ اُس وقت نہ تو لوگوں میں اس قسم کے معاملات سمجھنے کی استعداد پیدا ہوئی تھی، اور نہ عام طور پر دلچسپی لی جاتی تھی۔ ہندوستان میں اس وقت جس قدر اردو اخبار نکلتے تھے، سب نے مدحت پاشا کے مقدمہ کو "باغیوں" کے مقدمہ سے تعبیر کیا تھا۔ اُس زمانے کے بعض اخبارات کے فائل ہماری نظر سے گزرے ہیں۔ کلکتہ کے "اردو گائیڈ" اور لاہور کے "انجمن پنجاب" نے "باغی مدحت پاشا" کی سزایابی کی خبریں شائع کی تھیں!

مقدمہ کے بعد مدحت پاشا طائف کے قلعہ میں قید کر دیا گیا۔ اور کچھ دنوں بعد گلا گھونٹ کر مار ڈالا گیا۔ اُس وقت دُنیا اِس مظلوم کو بالکل بھلا چکی تھی۔ اصلاح پسند ترکوں کے سوا جو یورپ میں منتشر ہو چکے تھے، کوئی جماعت ایسی نہ تھی، جسے حقیقتِ حال کا علم ہو، یا اِس کی شخصیت میں دلچسپی رکھتی ہو۔

یلدز کی دعایتہ

برسوں پر برس گزر گئے، اور اِس قتل ظلم و استبداد کی ہولناک موت کی حقیقت دنیا کی نظروں سے پوشیدہ رہی۔ قسطنطنیہ میں عہد حمیدی کے تمام مستبدانہ اعمال اپنی پوری سرگرمی کے ساتھ شروع ہو چکے تھے مدحت پاشا اور اس کے رفقا کا نام لینا ایسا ہی ناقابلِ معافی جرم تھا جیسا "اصلاح" اور "دستور" یا "پارلیمنٹ" کا نام لینا۔ کئی کتابوں کی اشاعت

محض اس بنا پر صیغۂ احتساب نے (جو "نظارۂ معارف" کے نام سے قائم کیا گیا تھا) روک دی کہ اُن کے مصنفین کا نام بھی "مدحت" تھا۔

مدحت پاشا کے اعمالِ حیات کو دُنیا کی نظروں میں مذموم ثابت کرنے کے لئے ٹرکی اور ٹرکی سے باہر بے شمار اہلِ قلم کی خدمات خرید لی گئی تھیں اور وہ تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد کوئی نہ کوئی ایسی تحریر شائع کرتے رہتے تھے۔ جس کے ذریعے مدحت اور اس کی جماعت کو ملک و سلطنت کا دشمن ثابت کیا جاتا تھا۔ اور سلطان عبدالحمید کے قاتلانہ اعمال کی مدحت سرائی کی جاتی تھی۔ قسطنطنیہ میں احمد فارس شدیاق کا عربی اخبار "الجوائب" اس کام میں سب سے زیادہ پُرجوش اور سرگرم تھا۔ اُس نے بار بار اپنے قارئین کو یقین دلانا چاہا۔ کہ "مدحت اور اس کی جماعت کا اصلی مقصود دینِ مقدس اسلام کی بیخ کنی کرنی تھی!" یورپ اور انگلستان میں بھی قصر یلدز کے ایجنٹ بے دریغ روپیہ خرچ کر رہے تھے۔ بہت سے اخبار اور اخبار نویس تھے جنہوں نے اپنی خدمات یلدز کے حوالہ کر دی تھیں۔ ۱۸۹۰ء میں ایک انگریزی کتاب "دواز دہ سالہ عہدِ حکومت سلطان عبدالحمید" کے نام سے انگلستان میں شائع ہوئی تھی۔ اُس کے دیباچہ میں ظاہر کیا گیا تھا کہ "یہ انگلستان کی ایک شہزادی کی ذاتی تحقیقات کا نتیجہ ہے" یہ کتاب بھی حمیدی دعایت (پروپیگنڈا) کا نتیجہ تھی، اور اس لئے شائع کرائی گئی تھی تاکہ سر ہنری ایلیٹ کے اُن مضامین کا جواب دے دیا جائے جو اُس نے مدحت پاشا اور اُس کی مصلحانہ مساعی کی حمایت میں لکھے تھے۔ اس

کتاب کا اُردو ترجمہ ہندوستان میں شائع ہو چکا ہے۔

انکشافِ حقیقت

ایک عرصہ کے بعد جب مدحت پاشا کا لڑکا علی حیدر بیلے جوان ہوا، تو اُس کی ماں نعیمہ خانم نے اُس کے باپ کی آخری امانت اُس کے سپرد کر دی یہ امانت کیا تھی؟ یہ ایک نامکمل خود نوشتہ سوانح حیات تھی، جو اس شہیدِ حریت نے طائف کے قید خانہ میں لکھی تھی۔ اور چند خطوط تھے، جو اس کے ساتھیوں نے طائف سے بھیجے تھے۔ اِن خطوط میں اُن تمام ہولناک واقعات کی تفصیل درج تھی، جو طائف کے محبس میں پیش آئے تھے۔

یہ خطوط طائف کے قید خانے سے کیونکر بھیجے گئے۔ اور کس ذریعہ سے مرحوم کے خاندان تک پہنچے؟ اس کی تفصیل ان اوراق میں درج تھی۔ اس زمانے میں مصر کے خاندان خدیوی کی ایک امیرزادی، بیگم صفوت پاشا نے مکہ معظمہ میں قیام اختیار کر لیا تھا، اور اپنی دولت و ریاست کی وجہ سے شریف اور گورنر حجاز پر بہت رسوخ رکھتی تھی۔ یہ بیگم مدحت پاشا اور اُس کے مصلحانہ اعمال سے واقف تھی۔ اِسے جب معلوم ہوا، کہ وہ مع اپنے رفیقوں کے طائف میں قید کیا گیا ہے۔ تو آمادہ ہو گئی۔ کہ اپنی موجودگی سے ان کی مصیبت کم کرنے کی کوشش کرے۔ اور تو کچھ نہ کر سکی، لیکن اس کی وجہ سے خط و کتابت کا محفوظ ذریعہ پیدا ہو گیا۔ طائف کا ایک فوجی ڈاکٹر فخری بیلے اُس کے زیر اثر تھا اُسے قیدیوں کے دیکھنے کی اجازت تھی۔ وہ اِن سے پوشیدہ خطوط لے

یقیناً وہ مکہ معظمہ پہنچا دیتا۔ مکہ سے خطوط مصر بھیج دیئے جاتے۔ مصر سے سمرنا کی ایک فرانسیسی کمپنی کے دفتر میں پہنچ جاتے۔ جہاں مدحت پاشا کا خاندان مقیم تھا۔ کمپنی کے دفتر کا منتظم مدحت پاشا کی بیوی اور بہن تک پہنچا دیتا۔

البتہ مدحت پاشا کی خود نوشتہ سوانحِ عمری نا تمام تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یا تو تکمیل کا موقعہ نہیں ملا۔ یا بقیہ مسودہ ضائع ہو گیا۔

علی حیدر بے نے ان اوراق کی مدحت پاشا کے اعمالِ حیات پر ایک کتاب مرتب کی، اور ۱۹۰۶ء میں پیرس سے شائع کی۔ پہلے فرانسیسی زبان میں شائع ہوئی تھی۔ پھر اُس کا انگریزی ایڈیشن بھی شائع ہو گیا۔ یہ پہلا موقعہ تھا۔ کہ دنیا کو حقیقتِ حال سے واقف ہونے کا موقعہ ملا۔ اور کذب و افترا کے وہ تمام پردے چاک ہو گئے۔ جو عبدالحمید اور اُس کے حامیوں نے اس راستباز مصلح کی زندگی پر ڈال دیئے تھے۔ قصر یلدز کے کارپردازوں نے بہت کوششیں کیں۔ کہ کسی طرح اس کتاب کی قطعی شہادتیں کمزور ثابت کر دیں لیکن اب ۲۰ سال کی مستور حقیقت عالم آشکارا ہو چکی تھی، اور حقیقت جب ایک مرتبہ آشکارا ہو جاتی ہے، تو پھر دُنیا کی کوئی طاقت اُسے مسخر نہیں کر سکتی!

طائف کا مدفون صندوق

۱۹۰۸ء کے انقلاب دستور کے بعد اس سلسلہ میں ایک نیا انکشاف

ہوا۔ معلوم ہوتا ہے، اس شہید ظلم کی مقدس امانت صرف اُس کے خاندان ہی میں محفوظ نہ تھی، بلکہ طائف کی زمین نے بھی اپنا آغوشِ صیانت کھول دیا تھا، تاکہ اُس کی آخری امانت اپنے سینہ میں چھپالے، اور وقتِ مناسب کی منتظر رہے۔ علی حیدر بیگ کو خود نوشتہ سوانح عمری کا جو مسودہ اپنی والدہ سے ملا تھا، وہ نا تمام تھا، اور کچھ پتہ نہیں چلا تھا۔ کہ اصل میں نا تمام تھا، یا اس کے بقیہ اوراق ضائع ہو گئے تھے۔ اِعلان دستور کے بعد یکایک یہ خبر ترکی اخبارات میں چھپی۔ کہ "وصفی آفندی مدیرِ اوراق (ریکارڈکیپر) طائف نے ۳۰ برس کے بعد، طائف کے ایک باغ بیرونِ شہر سے وہ آہنی صندوق نکالا ہے، جس میں مدحت پاشا کی خود نوشتہ کتاب محفوظ تھی۔ وصفی آفندی نے مدحت پاشا کے قتل کے بعد ۱۵۔ ذیقعد ۱۳۰۲ء کو زمین میں دفن کر دیا تھا۔"

وصفی آفندی نے یہ صندوق علی حیدر بیگ کے حوالہ کر دیا۔ تحقیقات سے معلوم ہوا۔ کہ مدحت پاشا نے اپنی کتاب مکمل کر لی تھی، اور احتیاطاً اس کی دو نقلیں بھی، اپنے رفیق حبس شیخ خیر اللہ آفندی (سابق شیخ الاسلام) سے کرالی تھیں۔ تاکہ اگر اصل نسخہ محفوظ نہ رہ سکے۔ تو اس کی نقل موجود رہے اصل نسخہ کا ابتدائی حصہ بدفعات سمرنا بھیجدیا گیا، بقیہ اجزاء ابھی نہیں بھیجے گئے تھے۔ کہ ۱۲ رجب ۱۳۰۱ہجری کی وہ ہولناک رات آگئی۔ جو مرحوم اور اُس کے ساتھی محمود پاشا داماد کے قتل کی رات تھی۔ اِس طرح مرحوم کو بقیہ اوراق بھیجنے کا موقعہ نہیں ملا۔ یہ اوراق قتل کے بعد قید خانہ کے حکام

کو مِل گئے تھے۔ اور قسطنطنیہ نہ بھیج دئے گئے تھے۔ لیکن ان کی دو نقلیں خیر اللہ آفندی کے پاس رہ گئی تھیں۔ خیر اللہ آفندی نے کوشش کی کہ کسی طرح یہ دونوں نسخے کسی محفوظ مقام پہ پہنچ جائیں۔ اس نے ایک نسخہ اپنے معتمد دوست کمال آفندی شیخ تکیہ آستانہ تک پہنچا دینے کیلئے ایک شخص مصطفےٰ آفندی نامی کے سپرد کیا۔ اور دوسرا طائف کے ڈاکٹر فخری بے کو دے دیا۔ پہلا نسخہ کمال آفندی تک نہ پہنچ سکا۔ اور مصطفےٰ آفندی کا انتقال ہو گیا۔ لیکن دوسرا نسخہ ڈاکٹر فخری نے صفی آفندی مدیر اوراق طائف کے سپرد کر دیا۔ صفی آفندی مدحت پاشا کی جماعت سے ہمدردی رکھتا تھا۔ اور دل سے اصلاح پسند تھا۔ اس نے اِس امانت کی قدر کی، اور ایک آہنی صندوق میں بند کر کے شہر کے باہر دفن کر دیا۔

مدحت پاشا کی خود نوشتہ سوانحعمری

علی حیدر بے انقلاب کے بعد قسطنطنیہ آگیا تھا۔ اس نے اس مسودہ کا پچھلے مسودہ سے مقابلہ کیا؛ اور ترکی میں ایک نئی کتاب مرتب کر کے ۱۹۰۸ء میں شائع کر دی۔ یہ مدحت پاشا کی سرگذشت حیات کا مکمل مجموعہ ہے۔ اس میں اس کی خود نوشتہ سوانحعمری ہے۔ قید خانہ طائف کے تمام خطوط ہیں، اصلاح نظام حکومت کی تمام یادداشتیں ہیں،

اور آخر میں چند ضمیمے ہیں جن سے کتاب کے بعض تفصیل طلب مقامات کی مزید تشریح ہو جاتی ہے۔

علی حیدر بیک اس مجموعہ کے دیباچہ میں لکھتا ہے:۔

ایک ایسے موقعہ پر جبکہ میری قوم قیام دستور کی یادگار منا رہی ہے (جولائی ۱۹۱۹ء) میں اپنے والد مرحوم کی خود نوشتہ سوانح حیات کا ہدیہ اُس کے سامنے پیش کرتا ہوں، اور اُمید کرتا ہوں۔ کہ یہ عبرت و موعظت کا ذریعہ ہوگا!۔

جب ہمارا وطن عزیز اپنی صدہا سالہ عظمت و شوکت کی بلندیوں سے تنزل کے قعر ذلت میں گر رہا تھا؛ اور عدل و نظام کے فقدان نے اُمید و مراد کے تمام دروازے بند کر دئے تھے، تو اُس وقت ان اوراق کا مصنف ملک و ملت کی خدمت کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور اپنی زندگی کے کامل ۴۵ سال اس راہ میں بسر کر دیئے۔ یہاں تک کہ اسی کی راہ میں اپنی جان عزیز بھی قربان کر ڈالی۔

"میرے والد نے یہ اوراق قلعۂ طائف کے قیدخانہ میں اُس وقت لکھے تھے، جبکہ وہ خونی مجرموں کی طرح ایک تنگ کوٹھڑی میں مقید تھا، اور شقی و جانی پاسبانوں کی نگاہیں ہر وقت اُس پر لگی رہتی تھیں۔ مسودہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُس کا اکثر حصہ ایک ایک دو دو سطر کر کے مختلف اوقات میں لکھا گیا ہے، اور بہت سے مقامات میں ناتمام جملوں اور لفظوں پر قلم کی کشش رُک گئی ہے۔ وہ قلم اور کاغذ فرش کے نیچے چھپا

کر رکھ دیا کرتے تھے، اور جب کبھی پاسبانوں کی نگاہوں سے مہلت ملتی تھی، لکھنے میں مشغول ہو جاتے تھے۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا کہ پوری دو سطریں بھی نہیں لکھنے پاتے تھے کہ کسی آدمی کی آہٹ سنائی دیتی یا باہر سے باتوں کی آواز آنے لگتی، اور وہ قلم کاغذ چھپا دینے پر مجبور ہو جاتے!۔

"عین اُس حالت میں بھی جبکہ موت سامنے تھی، زندگی و راحت کے تمام وسائل مفقود ہو چکے تھے، ضعفِ پیری اور امراض کے آلام سے قویٰ معطّل ہو رہے تھے، اور ایک جابر و مستبد پادشاہ اور اُس کے رذیل اور جرائم پیشہ حکّام ہر آن اُس کے انفاسِ حیات کم کرنے کے درپے ہو رہی ہے، وہ اپنی قوم اور ملّت کی خدمت سے بے فکر نہیں ہوا، اور محض اِس امیدِ موہوم سے کہ شاید اُس کے لکھے ہوئے اوراق کسی وقت قوم کی نظروں تک پہنچ جائیں، اُس نے اپنی زندگی کے تمام تجاربت و افکار قلمبند کر دیئے۔ عین اُس وقت جبکہ عبدالحمید اُس کی موت کے وسائل پر غور کر رہا تھا، وہ قید خانہ کی کوٹھڑی کے اندر اُن وسائل کے قلمبند کرنے میں مشغول تھا، جن کے ذریعہ عبدالحمید کا عرش مملکت موت کے خطرات سے نجات پا سکتا تھا!۔

"میرے والد نے یہ کتاب قید خانہ میں لکھی، اور اس کا ایک حصّہ سمرنا میں اپنے اہل و عیال کے پاس بھجوا دیا۔ یہ ابتدائی حصّہ اور بعض خطوط مجھے اپنی والدہ مرحومہ سے ملے تھے، اور میں نے انہیں ایک مقدّس

تذکار سمجھ کر محفوظ رکھا تھا چند سال پیشتر یں نے یورپ میں جو کتاب مرحوم کے وقائع حیات پر شائع کی تھی، وہ انھی اوراق سے مرتب کی گئی تھی۔

یہ اُس شخص کا اثر ہے جسے ۱۲ ررجب ۱۳۰۱ھ کو رات کے ۶ ربجے (یعنی انگریزی گھڑی کے حساب سے بارہ بجے) عبدالحمید کے حکم سے قیدخانہ طائف میں گلا گھونٹ کر ہلاک کر ڈالا گیا۔ اس لئے ہلاک کر ڈالا گیا، کہ وہ ظلم و استبداد کا مخالف تھا، اور عدل و دستور کا داعی تھا۔ آج جبکہ تمام مملکت عثمانیہ قیام و دستور کے یادگار کی خوشیاں منا رہی ہے، بیجا نہیں، اگر میں یہ اُمید کروں، کہ دستور عثمانی کے اس شہید کی یاد ہر فرد قوم کے دل میں تازہ ہو جائے!"

سوانح حیات

مدحت پاشا کی اسی خود نوشتہ سوانحعمری سے ہم مختصراً اس کے حالات نقل کرتے ہیں۔ اس کے بعد اُن خطوط کا ترجمہ درج کریں گے، جو قلعہ طائف سے بھیجے گئے تھے۔

ابتدائی تعلیم

مدحت پاشا ابن قاضی حاجی حافظ محمد اشرف:

صفر ۱۲۳۸ھ میں بمقام قسطنطنیہ پیدا ہوا۔ والدین نے احمد شفیق نام رکھا تھا۔ دس برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔ اور حافظ شفیق کہلانے

لگا۔

۱۲۳۹ھ میں اس کے والد علاقۂ لوویچ کے قاضی مقرر ہوگئے یہاں اس نے لکھنا سیکھا، اور ایک برس بعد جب وہ واپس ہوا تو عاکف پاشا وزیر خارجہ کے حکم سے دیوان ہمایونی میں داخل کر لیا گیا۔ یہاں اس نے اس رسم الخط کی مشق کی جو اس محکمہ کے لئے خاص ہے۔ اس محکمہ کی تعلیم گاہ کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی۔ کہ وہ اپنے تمام فارغ التحصیل طلبا کو ایک علیحدہ نام یا لقب دے دیا کرتی تھی۔ چنانچہ اس نے حافظ شفیق کے لئے بھی ایک نیا نام تجویز کیا۔ یہ "مدحت" تھا، اس دن سے "شفیق" کی جگہ "مدحت" کے نام سے پکارا جانے لگا۔

۱۲۵۱ھ میں اس کے والد علاقۂ لوفچہ کے قاضی مقرر ہوئے مدحت بھی ساتھ گیا۔ اور تعلیم حاصل کرتا رہا، اس کے والد چونکہ فارغ التحصیل عالم تھے، اس لئے شروع ہی سے اسے فارسی، عربی، اور دینی علوم کی تعلیم دی گئی۔ لوفچہ سے واپس آنے کے بعد اس نے آستانہ کی تاریخی مسجد جامع فاتح " میں دینی علوم کی تکمیل کی اور فارسی زبان میں بھی کامل مہارت حاصل کر لی۔

جب ۱۲۵۴ھ میں حکومت نے "مدرسۂ عرفانیہ" جاری کیا۔ اور منتخب ہونہار طالب علم اس میں داخل کئے گئے، تو ان میں ایک مدحت آفندی بھی تھا۔ لیکن اس نے جلد دیکھ لیا۔ کہ اس مدرسہ کے طالب علم اس کے برابر قابلیت نہیں رکھتے۔ اور تعلیم بھی بہت معمولی درجہ کی ہے

اس لئے برداشتہ خاطر ہوکر چھوڑ دیا۔

عملی زندگی

سنہ ۱۲۵۷ھ میں اس نے اپنی تعلیم ختم کر لی۔ مگر اس کی عملی زندگی، اس سے بہت پہلے سے شروع ہو چکی تھی۔ وہ کم عمری ہی سے سرکاری دفاتر میں ملازم ہو گیا تھا۔ دفتر کا کام بھی انجام دیتا اور تعلیم بھی جاری رکھتا۔ لیکن سنہ ۱۲۵۸ھ میں اس نے خالص عملی زندگی میں قدم رکھا۔ ۲۵۰۰ قرش تنخواہ پر اسے ایک مستقل جگہ مل گئی۔ یہ ولایت شام میں سرکاری کاغذات کی تحریر کی جگہ تھی۔ وہ تین برس تک اسی جگہ پر مامور رہا۔ پھر سنہ ۱۲۶۱ھ میں شامی پاشا والی قونیہ کے دفتر میں لے لیا گیا۔ سنہ ۱۲۶۳ھ میں اسی والی کے ساتھ صوبہ قسطمونی میں گیا۔ سنہ ۱۲۶۴ھ میں قسطنطنیہ واپس آیا اور اسی زمانہ میں اس کی شادی ہوئی۔ اس کے بعد اسے وزیر اعظم کے دفتر میں انشاء وکتابت کی معزز جگہ مل گئی۔ اس جگہ کے مل جانے سے اس پر اعلیٰ اور مرکزی مناصب پہ مامور ہونے لگا۔

تفتیش (انسپکشن)

سنہ ۱۲۶۷ء میں حلب وشام کے جنگی خانے میں سخت بدنظمی پیدا ہوئی حتیٰ کہ خزانہ حکومت کے ۲۰ تھیلے غائب ہو گئے۔ اس معاملہ کی تفتیش کے لئے مدحت آفندی بھیجا گیا۔ اسے خفیہ طور پر ہدایت کی گئی تھی کہ عربی

ممالک کے سپہ سالارِ اعظم محمدؐ پاشا قبرصلی کے طرزِ عمل کی بھی تحقیقات کرے۔ ۶ مہینے کی محنت کے بعد اس نے ثابت کر دیا کہ نقدی کے ۲۰ تھیلے نہیں، بلکہ ۵ ہزار تھیلے چوری ہو گئے ہیں۔ چور کا بھی پتہ چلا لیا، اور اُس سے ایک ہزار ۴۰۰ تھیلے وصول کر لئے۔ نیز ناقابلِ رد دلائل سے ثابت کر دیا کہ سپہ سالار نے قوم دروز کے معاملے میں سخت غلطیاں کی ہیں۔

مجلسِ والا کی صدارت

وزیرِ اعظم رشید پاشا نے مدحت آفندی کی اس خدمت کی بہت تعریف کی۔ عرب کا سپہ سالار معزول کر دیا گیا۔ اور مدحت کو ۱۲۶۹ھ میں مجلسِ والا کا صدر مقرر کیا گیا۔ یہ منصب اس کی فطری اور غیر معمولی انتظامی قابلیت کے ظہور کے لئے ہر طرح موزوں تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ کے اندر اس کی قابلیتوں کے ایسے نمایاں ثبوت ملے کہ وہ رشید پاشا عالی پاشا، رشدی پاشا وغیرہ ارکانِ سلطنت کا معتمد علیہ بن گیا چنانچہ جب مسئلہ کریمیا کے حل کرنے کے لئے روسی پرنس منچیکوف قسطنطنیہ آیا، تو معاہدوں کی تحریر اسی کے سپرد کر دی گئی۔ جو بہت بڑی ذمہ داری کا کام تھا۔

ارکانِ حکومت سے مخالفت

اب ترقی کرتے کرتے، مدحت آفندی اناطولیہ میں کاتب ثانی کے

عہدے پر پہنچ گیا تھا۔ سنہ ۱۲۷۰ھ میں محمد پاشا قبرصلی، وزیرِ اعظم مقرر ہوا
یہ "مدحت آفندی کا سخت دشمن تھا۔ کیونکہ اسی نے اُسے عرب کی سپہ سالاری
سے معزول کرایا تھا۔ اب اُس نے انتقام لینا اور سرکاری ملازمت سے
خارج کرا دینا چاہا۔ اُس نے بہت کوشش کی۔ مگر کوئی بات قابل
گرفت نہیں ملی۔ آخر اُس نے خیال کیا "اسے صوبہ جات رومیلی کا حاکم
بنا کر بھیج دیا جائے۔" اور چونکہ سخت ہنگامے بپا تھے، اور بہت سے
والی، امن و امان قائم کرنے میں ناکام رہ چکے تھے۔ اس لئے مدحت
آفندی بھی ناکام رہے گا۔ اور اس طرح اُسے نالائق قرار دینے کا بہتر
موقعہ نکل آئے گا۔ چنانچہ اُس نے احکام صادر کر دئے۔

اب مدحت آفندی کے لئے سخت مشکل پیش آئی۔ وہ وزیرِ اعظم کی بدنیتی
سے واقف ہو چکا تھا، اگر نہیں جاتا تھا۔ تو عدول حکمی ہوتی تھی۔ جاتا تھا
تو ناکامی کا اندیشہ تھا۔ بہرحال اُس نے جانے کا فیصلہ کر لیا، اور ۱۲۷۱ھ
میں ایک فوجی مہم ساتھ لے کر روانہ ہو گیا۔

یہاں مدحت آفندی نے حیرت انگیز قابلیت کا ثبوت دیا۔ صرف
۶ مہینے کی قلیل مدت میں ۲۸۰ باغی سرغناؤں کو گرفتار کر لیا۔ ۴۰ کو حکومت
کی بلا اجازت پھانسی دے دی۔ ۸۰ کو آستانہ کے قید خانے میں بھیج دیا
باقی کو قانون کے مطابق سخت سزائیں دیں۔

باغی صوبوں نے نئے حاکم کی یہ غیر معمولی مستعدی دیکھی۔ تو اطاعت
کے لئے فوراً سر جھکا دئے۔ یورپ کی زبان بالکل بند ہو گئی۔ جو بلقان کی

اس پیچیدگی کو اپنی مداخلت کا ذریعہ بنا رہا تھا۔ خوش قسمتی سے اب محمد پاشا بھی معزول ہو چکا تھا۔ رشید پاشا اُن کی جگہ وزیر اعظم تھا۔ اُس نے مدحت آفندی کی شاندار خدمات کا اعتراف کیا۔ اور آستانہ واپس بُلا لیا۔ مدحت آفندی نے رُومیلی کے حالات کی مفصّل رو داد پیش کی۔ اور اصلاحات کا ایک مسودہ بھی تیار کیا۔ حکومت نے اسے شکریہ کے ساتھ قبول کیا۔ مگر بعض حالات اور تبدیلیاں ایسی پیش آگئیں۔ کہ اصلاحات کی تجاویز پر کوئی عملی کارروائی نہ ہو سکی۔ دراصل حکومت کا مزاج صدیوں سے ایسا ہو گیا تھا کہ بغیر کسی بنیادی تغیّر کے اصلاحات کی تجاویز سود مند نہیں ہو سکتی تھیں۔

وزیرِ اعظم نے مدحت آفندی کو مجلس والا میں دوبارہ داخل کیا۔ مگر ابھی چند ماہ بھی اس صورتِ حال پر نہیں گزرے تھے۔ کہ رشید پاشا پھر معزول ہو گیا اور مصر چلا گیا۔ اس کی جگہ عالی پاشا کو ملی، مگر اُسے بھی یورپ کا سفر پیش آگیا۔ اور دارالحکومت سے غیر حاضر ہو گیا۔ اس کی نیابت محمد پاشا قبرصی کو مل گئی۔ اسی محمدؐ پاشا کو جو مدحت کا جانی دشمن تھا۔ اس نے برسرِ اقتدار آتے ہی پھر انتقامی تدابیر کا عمل میں لانا شروع کر دیا۔

اِس مرتبہ مدحت پر یہ تہمت لگائی گئی کہ اُس نے حکومت کے بعض محاصل پر قبضہ کر لیا ہے۔ چنانچہ باضابطہ مقدمہ قائم ہو گیا۔ مگر پہلی ہی پیشی میں ثابت ہو گیا۔ کہ الزام کی کوئی اصلیت نہیں۔ محض اتہام ہے۔ ایک گواہ نے تو علانیہ عدالت کے سامنے اقرار کر لیا کہ اُسے جھوٹ بولنے پر مجبور کیا

گیا ہے۔ اور مدحت کے خلاف اُس نے جو کچھ کہا ہے، سراسر باطل ہے "
مدحت آفندی عزت کے ساتھ بری ہو گیا، اور نائب وزیر اعظم کو سخت شرمندگی اُٹھانی پڑی۔

بلغاریہ اور سرویہ میں

اُس زمانے میں بلغاریہ کی حالت خراب ہونے لگی۔ حکام کے ظلم نے باشندوں کو پریشان کر ڈالا۔ مدحت آفندی تحقیقات کے لئے بھیجا گیا۔ اس نے اپنی روداد باب عالی میں پیش کر دی اور ثابت کیا۔ کہ باشندوں کی شکایتیں صحیح ہیں۔ گورنر سعید پاشا اور اس کے آدمیوں نے سخت فساد مچا رکھا ہے باب عالی نے اس کی روداد تسلیم کر لی۔ اور گورنر اور اُس کے عہدہ داروں کو معزول کر دیا۔

بلغاریہ سے فارغ ہو کر مدحت آفندی سرویہ گیا۔ وہاں بھی سخت ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ بعض علاقوں کے باشندوں نے ترکی حکام کو بالکل خارج کر دیا تھا۔ اور طوائف الملوکی قائم ہو گئی تھی۔ مدحت آفندی نے اس صوبے کی بھی اصلاح کی۔ اور باغی علاقوں میں از سرِ نو حکومت قائم کر دی۔

یورپ کا سفر

مدحت آفندی، قسطنطنیہ واپس آ گیا۔ اُسے یقین تھا۔ کہ حکومت

اس کی خدمات کا اعتراف کرے گی۔ مگر یہاں سلطان عبد المجید پر معزول گورنر سعید پاشا اور اُس کے دوستوں کا جادو چل چکا تھا۔ انہوں نے سلطان کو مدحت آفندی سے ناراض کرا دیا۔

اسی اثنا میں رشید پاشا کا بھی انتقال ہوگیا۔ جو مدحت کا سرپرست تھا۔ مدحت آفندی، سلطان کی ناراضگی سے افسردہ خاطر ہو چکا تھا۔ اپنے مربی کی وفات سے اور بھی زیادہ بے دل ہوا، اور سرکاری مناصب ترک کر دینے کا ارادہ کر لیا۔ ساتھ ہی اُسے خیال ہوا۔ کہ ممالک یورپ کی سیر و سیاحت کرے۔ جن کی علمی و تمدنی ترقیات کے افسانے اِس کے گوش گزار ہو چکے تھے چنانچہ ۱۲۷۴ھ میں یورپ روانہ ہوگیا۔ ۶ مہینے وہاں قیام کیا۔ پیرس، لندن، وائنا، بلجیم وغیرہ کی سیر کی۔ اور یورپ کی ترقی کے اسباب و وسائل معلوم کیے۔

فرانسیسی زبان

مدحت آفندی کی طالب علمی کے زمانے میں فرانسیسی زبان کو ٹرکی میں کوئی اہمیت حاصل نہ تھی۔ اِس لئے اُسے کبھی اِس طرف کوئی توجہ نہیں ہوئی لیکن اب حالات میں عظیم تبدیلی واقع ہو چکی تھی، اور ہر سیاسی مدبر کے لئے اس زبان سے واقفیت لازمی ہوگئی تھی۔ مدحت آفندی نے اپنے اندر یہ کمی محسوس کی۔ اور اس زبان کی تحصیل پر کمربستہ ہوگیا۔ وہ اپنی فرصت کے اوقات میں لطورِ خود مطالعہ کرتا رہتا۔ یہاں تک کہ یورپ کا سفر پیش

آیا۔ اور اس زبان میں اُس نے پوری مہارت حاصل کر لی

رتبہ وزارت اور صوبہ کی ولایت

۱۲۷۵ھ میں مدحت آفندی یورپ سے واپس آیا۔ اور دوبارہ مجلس والا کی صدارت کے لئے منتخب کیا گیا۔ اسی اثناء میں محمد پاشا قبرصلی پرانا دشمن وزیر اعظم ہو چکا تھا۔ مدحت آفندی کو خوف تھا کہ پھر اُس کی عداوت کا نشانہ بنے گا۔ مگر یہ دیکھ کر اُسے تعجب ہوا۔ کہ اب مخالفت کی جگہ اس کی طرف سے موافقت کے اظہارات شروع ہو گئے تھے۔ اس نے مدحت آفندی کو طلب کیا۔ گذشتہ معاملات کی معافی چاہی۔ اور سلطان عبد المجید سے بھی سفارش کی۔ کہ اس کی پچھلی خدمات کے اعتراف میں وزارت کا اعزازی رتبہ بخشا جائے، اور صوبہ نش کی حکومت سپرد کر دی جائے۔ چنانچہ ۱۲۷۷ھ میں مدحت آفندی اس صوبہ کا والی مقرر ہو گیا۔ اور سلطان عبد المجید کی وفات تک اسی منصب پر مامور رہا۔

سلطان عبد العزیز

سلطان عبد العزیز کے آخری عہد میں سلطنت عثمانیہ کی حالت از حد زبوں ہو گئی، ہر طرف داخلی شورشیں برپا ہو گئیں، اور یورپ نے متحد ہو کر از سر نو دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔

بد قسمتی سے سلطان، اپنے وزیر اعظم محمود ندیم پاشا کے قبضہ میں تھے۔

اور ندیم پاشا، روسی سفیر جنرل ایگنا ٹیف کے اشاروں پر حرکت کر رہا تھا ترکی قوم اس حقیقت سے واقف ہوگئی تھی۔ اور ندیم پاشا کی معزولی کا مطالبہ کر رہی تھی۔ مگر سلطان نے کانوں میں تیل ڈال لیا تھا۔ نہ کسی کی نصیحت سنتا تھا۔ نہ کسی فریاد پر توجہ دیتا۔

اسی زمانے میں خبر مشہور ہوئی۔ کہ سلطان ۴۰ لاکھ پونڈ کا ایک نیا قرضہ لینے والے ہیں عام رائے اس خبر سے نہایت برہم ہوئی۔ کیونکہ سلطان کے اسراف نے سلطنت کا تمام خزانہ خالی کر دیا تھا۔ اور قرضوں کا ناقابل برداشت بوجھ پہلے ہی سے ملک کی کمر دن توڑ رہا تھا۔

اسی اثناء میں صوبۂ ہرزی گوینا کا مسئلہ پیش آیا۔ یہ محض حکومت کی غفلت کا نتیجہ تھا۔ عام رائے اب اور بھی زیادہ برہم ہوگئی۔ چند دن بعد خبریں آنا شروع ہوئیں۔ کہ بلقان میں بغاوت پھوٹ پڑی ہے۔ اور اس کے شعلے ادرنہ تک پہنچ گئے ہیں۔ اتنا ہی نہیں۔ بلکہ آستانہ میں بلقان کے مسلمان طالب علموں کے پاس خطوط پہنچے۔ کہ باغیوں نے تمہارے گھر لوٹ لئے۔ اور عزیز و اقارب قتل کر ڈالے۔ طالب علموں نے یہ وحشت ناک خبریں سنیں۔ تو جوش میں آ گئے۔ ان کے جوش نے شہر کی تمام مسلمان آبادی میں بھی ہیجان پیدا کر دیا۔ لوگوں کو پہلے سے یقین تھا۔ کہ حکومت، بلقان کے معاملات سے غفلت برت رہی ہے۔ اور ندیم پاشا روس کے اشارے سے یہ سب کچھ کر رہا ہے۔ روس کا مقصد یہ تھا۔ کہ اس بہانے سے اُسے مداخلت کا موقعہ ملے۔

بلقانی طالب علموں کے ساتھ ہزاروں مخلوق باب عالی کی طرف روانہ ہوئی اور وزیر اعظم سے ملاقات کا مطالبہ کیا۔ وزیر اعظم نے یہ حالت دیکھی۔ تو ڈر گیا، اور سلطان کو مشورہ دیا۔ کہ نئی وزارت کا اعلان کر کے عوام الناس کا جوش ٹھنڈا کر دیں۔ چنانچہ محمود ندیم پاشا اور حسن آفندی شیخ الاسلام دونوں معزول کر دیئے گئے۔ رشدی پاشا وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ اور خیر اللہ آفندی شیخ الاسلام بنائے گئے۔ نیز مدحت پاشا بھی رتبۂ وزارت کے ساتھ مجلس اعلیٰ کا رکن مقرر ہو گیا۔

لیکن وزارت کی تبدیلی سے حالات میں کوئی اصلاح نہیں ہوئی۔ ندیم پاشا اگرچہ معزول کر دیا گیا تھا۔ لیکن محض ایک سطحی تبدیلی تھی۔ سلطان بدستور ندیم پاشا کے ہاتھوں میں تھا۔ ندیم پاشا روسی سفارت خانہ سے احکام حاصل کرتا، اور ان کے مطابق سلطان کو مخفی مشورے دیتا رہتا۔

عام رائے نے جلد معلوم کر لیا۔ کہ ندیم پاشا امروز فردا ہی میں پھر برسر حکومت آجائے گا۔ اس کی معزولی، محض ایک دکھاوے کی کارروائی ہے۔ اسی اثناء میں۔ روسی سفیر جنرل اگناٹیف نے ہر طرف مشہور کر دیا۔ کہ دارالسلطنت میں عنقریب بغاوت ہونے والی ہے۔ مسلمان عیسائیوں کے قتل کی عام طیاریاں کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی اُس نے یہ بھی کیا۔ کہ مانٹی نگرو سے سَو مسلح نوجوان بلائے۔ اور اپنی سفارت کی حفاظت کے لئے مقرر کر دیئے اس کارروائی نے تمام شہر میں تشویش پیدا کر دی۔ قسطنطنیہ کی مسیحی آبادی نے کاروبار بند کر دیا۔ اور شہر چھوڑ دینا چاہا۔ ان کارروائیوں سے روسی سفیر کا

مدعا یہ تھا۔ کہ محمود پاشا کی دوبارہ وزارت کے لئے میدان صاف کرے۔ وہ یہ دکھلانا چاہتا تھا۔ کہ نئی وزارت امن و امان قائم نہیں رکھ سکتی، اور مسیحی رعایا کے لئے خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔

ترکوں نے یہ حالت دیکھی، تو وہ مرعوب نہیں ہوئے، انہوں نے خود سلطان کے معزول کر دینے کا ارادہ کر لیا۔ کیونکہ اب وہ سمجھ گئے تھے۔ کہ اس شخص کی موجودگی میں کسی قسم کی اصلاح ممکن نہیں۔

یہ خبر ہوا کی طرح بازاروں میں پھیل گئی۔ وہاں سے قصر شاہی میں پہنچی۔ سلطان بہت پریشان ہوئے۔ والدہ سلطان نے مدحت پاشا کے پاس اپنا معتمد علیہ خواجہ سرا جوہر آغا بھیجا۔ اور دریافت کیا۔ کہ قوم کی ناراضی دور کرنے کے لئے کونسا طریقہ مفید ہو سکتا ہے؟

مدحت پاشا نے فوراً اصلاحات کا ایک مسودہ طیار کیا۔ اور سلطان کی خدمت میں یہ کہہ کر پیش کیا۔ کہ اسے جاری کر دینے سے عام رائے مطمئن ہو جائے گی۔ مگر سلطان کی نخوت نے اسے منظور نہ کیا۔

اس تمام مدت میں سلطان، محمود ندیم پاشا کے مشوروں پر عمل کرتا رہا اور محمود ندیم، جیسا کہ بیان ہو چکا ہے، روسی سفیر کی انگلیوں پر ناچ رہا تھا محمود ندیم نے سلطان کو ترغیب دی۔ کہ حسین عونی پاشا کو جلا وطن کر دیں۔ یہ روسی اثرات کا مخالف اور ایک دیانتدار شخص تھا۔ سلطان نے اسے صوبہ بروسہ کا حاکم مقرر کر کے حکم دیا۔ کہ پایہ تخت سے روانہ ہو جائے۔ حسین عونی بیمار تھا۔ مگر سلطان نے اسے جبراً بھجوا دیا۔ اسی قسم کا برتاؤ اور بہت سے

مخلص اشخاص کے ساتھ بھی کیا گیا۔

کچھ مدت بعد حسین عونی پاشا بروسہ سے لوٹ آیا۔ اور دیکھا کہ عام رائے سلطان کے معزولی کر دینے پر مصر ہے۔ اُس نے اس بارے میں بعض سر برآوردہ آدمیوں سے مشورہ کیا۔ سب نے بالاتفاق اس تجویز کی حمایت کی۔

سلطان کی معزولی

حسین عونی پاشا، رشدی پاشا، مدحت پاشا، اور خیر اللہ آفندی شیخ الاسلام نے مل کر طے کیا۔ کہ ۹ جمادی الاول کو ولی عہد مراد آفندی کو تخت نشین کر دیا جائے۔ لیکن اس تاریخ سے دو دن پہلے ہی سلطان عبدالعزیز کو کسی طرح اس معاملہ کی خبر پہنچ گئی۔ اور انہوں نے عونی پاشا کو ملاقات کے لئے اپنے محل میں طلب کیا۔ مگر عونی پاشا نہیں گئے۔ کیونکہ انہیں افشاء راز کا حال معلوم ہو گیا تھا۔ چونکہ اب مزید تاخیر میں خطرہ تھا۔ اس لئے یہی طے پایا۔ کہ فوراً نئی تخت نشینی عمل میں لائی جائے چنانچہ حسین عونی پاشا نے اُسی رات اپنے شرکاء کی مجلس منعقد کی، اور سلطان کی معزولی کے لئے بڑی تعداد میں فوج بھی جمع کر لی گئی۔

مدحت پاشا اپنی خود نوشتہ سوانحعمری میں لکھتے ہیں:۔

ہم نے مناسب سمجھا۔ کہ ولی عہد مراد آفندی کی تخت نشینی کا اعلان وزارت جنگ کی عمارت میں ہو۔ چنانچہ میں (مدحت پاشا) اور رشدی پاشا

صبح تڑکے وزارتِ جنگ کی طرف روانہ ہوئے حسین پاشا، احمد پاشا، ردیف پاشا، حسن پاشا، طولمہ باغچہ (قصرِ شاہی) میں گئے۔ تاکہ وہاں فوج کو ضروری احکام دیں۔

یہ تمام کارروائی پوری طرح مخفی رکھی گئی تھی۔ ہمیں یقین تھا کہ ہمارے رفقاء کے سوا کسی کو اِس کا علم نہیں ہے۔ لیکن جب ہم وزارتِ جنگ میں پہنچے، تو یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ کہ وہاں لاکھوں آدمی جمع ہیں۔ اور نئے سلطان کے ورود کا انتظار کر رہے ہیں۔ آج تک مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ یہ خبر تمام شہر میں راتوں رات کس طرح مشہور ہو گئی؟"

"مجمع، از حد جوش وخروش میں تھا۔ بڑی ہی بےچینی سے مراد آفندی کا انتظار کر رہا تھا۔ اچانک ولی عہد کی سواری نمودار ہوئی۔ حسین عونی پاشا اُن کے ساتھ بیٹھے تھے۔ تمام مجمع نے نئے سلطان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اور اُن کی تخت نشینی کی اطلاع بھیج دی گئی۔ دارالخلافہ میں جشن شروع ہو گیا۔ ہر طرف جھنڈے بلند ہو گئے۔ اجنبی جہازوں نے بھی اپنے علم اونچے کر دیئے۔ لیکن روسی سفارت خانہ نے مظاہرِ جشن میں کوئی حصّہ نہیں لیا۔ اور دو دن تک عالمِ تذبذب میں رہا۔

"روس کو محمود ندیم پاشا کی معزولی سے سخت رنج ہوا تھا۔ اب خود سلطان کی معزولی نے اُسے اور بھی برہم کر دیا۔ چنانچہ زارِ روس نے ترکی وزارتِ خارجیہ کے نام تار بھیجا کہ انہیں اِس بات پر سخت افسوس ہے کہ ایک معمولی سپہ سالار کی جرأت نے سلطان کو اُس کے تاج و تخت سے

محروم کر دیا ہے !"

"سلطان عبد العزیز معزول کر دیئے گئے ، لیکن اُن کی ذات اور عزت کو کوئی صدمہ نہیں پہنچایا گیا ۔ پہلے دستور تھا کہ معزول سلاطین قید کر دیئے جاتے تھے ۔ ہم بھی سلطنت کے مصالح کے لئے ایسا کر سکتے تھے مگر ہم نے نہیں کیا ۔ ہم جانتے تھے ۔ کہ ملک میں کوئی جماعت بھی سلطان کی طرفدار نہیں ہے ۔ لہذا انہیں قید کرنا قطعاً غیر ضروری تھا ۔ علاوہ بریں ہم دستوری نظام حکومت قائم کرنا چاہتے تھے ۔ اور دستوری حکومت میں کسی شخص کو بھی بغیر جرم کے قید کرنا جائز نہیں ہوتا ، اگرچہ وہ معزول پادشاہ ہی کیوں نہ ہو"

معزول ہونے کے بعد سلطان عبد العزیز نے سلطان مراد کو دستِ خاص سے مبارکباد کا خط لکھا ، اور محل طوب قپو سے "فرعیہ" میں منتقل کر دیئے جانے کی درخواست کی ۔ درخواست منظور کر لی گئی ۔ اور معزول سلطان نہایت عزت و احترام کے ساتھ اپنی تین سو بیویوں اور کنیزوں کے ساتھ نئے محل میں منتقل ہو گئے ۔

عبد العزیز کی خودکشی

ہم ابھی نئے سلطان کی تاجپوشی کے جلسوں سے پوری طرح فارغ بھی نہ ہوئے تھے ، کہ سلطان عبد العزیز نے اپنی نخوت و غرور کے جنون سے بے خود ہو کر خودکشی کر لی ۔

یہ واقعہ معزولی سے ۶ روز بعد پیش آیا۔ اتوار کے دن انہوں نے اپنے ایک ملازم سے قینچی طلب کی۔ اور اپنے بازو کی رگیں کاٹ ڈالیں۔ ان کی موت خودکشی سے ہوئی۔ یہ بالکل یقینی بات تھی۔ تاہم مزید احتیاط کے خیال سے ہم نے اس کی باقاعدہ تحقیقات بھی کرائی۔ تمام شاہی طبیبوں اور اجنبی سفارت خانوں کے ڈاکٹروں کو بلا کر معائنہ کرا لیا گیا۔ ان ڈاکٹروں کی تعداد ۱۹ کے قریب تھی۔ انہوں نے بالاتفاق فیصلہ کیا کہ سلطان نے خودکشی کی ہے۔

سلطان مراد کی بیماری

سلطان مراد کی تخت نشینی ایک عظیم الشان مجمع کے سامنے عمل میں آئی تھی۔ اتنا بڑا مجمع انہوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مجمع انتہائی جوش و خروش میں تھا۔ اور پوری قوت سے نعرے بلند کرتا تھا۔ نئے سلطان کے اعصاب پہ اس منظر نے بہت بڑا اثر کیا، اور وہ عصبی بیماری میں مبتلا ہو گئے۔ اس واقعہ کے چھٹے دن جب انہوں نے معزول سلطان عبدالعزیز کی خودکشی کا حال سنا، تو مرض نے اور بھی زیادہ شدت اختیار کی دوسرے ہی دن اُن میں جنون کی علامتیں ظاہر ہو گئیں۔ ہم نے یہ واقعہ احتیاطاً مخفی رکھا۔ اور علاج کرتے رہے۔ لیکن ۲۵ دن کے بعد ایک روز سلطان، باغ کے حوض میں پھاند پڑے اور محل کے خدام کو اُن کے جنون کا حال معلوم ہو گیا۔ اب اخفا ناممکن تھا۔ تھوڑی ہی

ہی دیر میں تمام شہر حقیقتِ حال سے واقف ہوگیا تھا!۔"

سلطان کی بیماری نے سلطنت کو سخت نقصان پہنچایا۔ ہم نے دستور اساسی طیار کر لیا تھا، مگر اسی بیماری کی وجہ سے اعلان ملتوی کر دیا۔ صرف یہی نہیں۔ بلکہ حکومت کے تمام کام معطل ہوگئے۔ حتیٰ کہ سفراء دول کے کاغذات تک کی تصدیق نہیں ہو سکی۔ اگرچہ وزارت وحکومت موجود تھی۔ مگر قانون کے مطابق ہر حکم کے لئے سلطان کی منظوری لازمی تھی اور سلطان اس قابل نہ تھے۔ کہ معاملاتِ سلطنت کی سماعت کر سکتے۔

ایک نئی مصیبت

اس صورتِ حال نے ہمیں سخت پریشان کر دیا تھا۔ ہم سلطنت کے معاملات پر غور کرنے کے لئے رات رات بھر بیٹھے رہتے۔ ایک رات میرے مکان پر شیخ الاسلام خیر اللہ آفندی اور وزرا سلطنت جمع تھے۔ کہ ایک شخص حسن چرکسی نامی آیا۔ یہ فوج میں افسر تھا۔ اور سلطان عبد العزیز کے لڑکے شہزادہ یوسف عزالدین کا ایڈی کانگ رہ چکا تھا۔ اس نے وزیر جنگ سے ایک بہت ضروری معاملہ کے لئے ملاقات کی درخواست کی۔ جوں ہی وہ اندر داخل ہوا، حسین عونی پاشا پر پستول نکال کر حملہ کر دیا۔ حسین عونی کے سینہ پر گولی لگی۔ اور اُن کا کام تمام ہوگیا۔ چونکہ ہمارے پاس ہتھیار نہیں تھے۔ بھاگنے پر مجبور ہوگئے۔ مگر قیصرلی احمد پاشا وزیر بحر نے قاتل کو گرفتار کرنا چاہا۔ قاتل نے انہیں بھی سخت زخمی کیا۔ وہ بھاگے۔ اُس

نے تعاقب کیا۔ میرا خادم احمد آغا اُس سے لپٹ گیا۔ مگر قاتل نے اُسے بھی قتل کر ڈالا۔ وزراء کے محافظ سپاہی دوڑے۔ مگر قاتل کی جیب میں ۵ پستول تھے۔ اُس نے ۵ آدمی اور قتل کر دیئے۔ اب کسی کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ کہ اُس کے قریب جاتے۔ قاتل اب ایک دوسرے کمرے میں گھُسا۔ وہاں راشد پاشا بیہوش پڑے تھے۔ اُس نے اُنہیں بھی قتل کر دیا۔ بالآخر جب کافی تعداد میں مسلح پولیس کے سپاہی پہنچے۔ تو وہ گرفتار کیا گیا۔

اِس حادثہ نے سلطنت کو بہت نقصان پہنچایا۔ حسین عونی پاشا فنون جنگ میں بے نظیر تھے۔ راشد پاشا، خارجی معاملات کے فہم میں مشہور تھے ہمارے دشمن اِن دونوں کی موت سے بہت خوش ہوئے،

بلقان اور جزیرۂ کریٹ کی شورشیں

ہم اِن مصائب میں گرفتار تھے۔ کہ مانٹی نگرو، سرویا، بلغاریہ اور کریٹ میں شورشیں برپا ہو گئیں۔ ہمارے عزم و استقلال کے لئے یہ بڑا ہی نازک وقت تھا۔ بااین ہمہ ہم نے بر وقت کارروائیوں میں ذرا بھی کوتاہی نہ کی۔ فوراً ہر طرف فوجیں روانہ کر دی گئیں۔ ہماری فوجوں نے غیر معمولی شجاعت و ہمت دکھائی۔ اور تمام شورشوں کا خاتمہ کر دیا۔

سلطان عبدالحمید کی تخت نشینی

لیکن سلطنت کی حفاظت کے لئے مجنون سلطان کی معزولی ناگزیر تھی اب قانون کے بموجب عبدالعزیز آفندی ولی عہد تھے۔ اس لئے وہی تخت نشین ہو سکتے تھے۔ دستور اساسی کا جو مسودہ میں نے تیار کیا تھا، ولیعہد نے ملاحظہ کر لیا تھا۔ اور اس سے بالکل متفق تھا۔ اُس نے بڑے ہی جوش سے کہا تھا کہ سلطنت کی نجات صرف ایسے ہی نظام حکومت سے ممکن ہے" اُس نے پورے یقین کے ساتھ اپنے اس عزم کا بھی یقین دلایا تھا کہ تخت نشین ہوتے ہی اُس کا اعلان کر دے گا۔ ہم خدام سلطنت کی مسرت بے حساب تھی۔ ہم برسوں سے جمہوریت کا جو خواب خرگوش دیکھ رہے تھے، اب اُس کی تعبیر ہمارے سامنے تھی۔ ہم نے خیال کیا کہ یہ نوجوان شہزادہ سلطنت اور اُمت کا نجات دہندہ ثابت ہو گا چنانچہ ۱۱ شعبان ۱۲۹۳ھ کو عبدالحمید کی تخت نشینی کا باقاعدہ اعلان کر دیا گیا۔

سفراء دول کی مؤتمر

بلقان کا مسئلہ، درحقیقت روس کا اُٹھایا ہوا تھا۔ لیکن جب ہماری فوجوں نے بلقانی باغیوں کے ٹکڑے اُڑا دیئے، تو روس نے چند نئے حیلے تراشنا شروع کر دیئے، اور دول یورپ کو ایک مؤتمر منعقد کرنے کی دعوت دی چنانچہ آستانہ میں دول عظمیٰ کے ۶ سفیروں کا اجتماع ہوا۔ انھوں نے

پہلی تجویز یہ طے کی۔کہ بلغاریہ کو اندرونی خود مختاری دے دی جائے۔

مدحت پاشا کی وزارت

ظاہر ہے، ہم اس قسم کی تجویزیں منظور نہیں کر سکتے تھے۔ اِن تجویزوں کا مان لینا، بلقان سے ہاتھ دھونا تھا۔مگر دول یورپ نے دباؤ ڈالنا شروع کیا۔رشدی پاشا وزیرِ اعظم بہت خائف تھے۔اس صورتِ حال نے مجھے مجبور کر دیا۔کہ وزیرِ اعظم کی کرسی پر بیٹھ جاؤں۔مَیں حالات کی ابتری سے بخوبی واقف تھا۔تاہم مَیں نے اصلاح کی کوشش شروع کر دی۔

ہماری مصیبت صرف یورپ ہی کی جانب سے نہ تھی۔بلکہ اس سے بھی بڑھ کر مصیبت یہ تھی۔کہ ہمارا خزانہ بالکل خالی تھا۔سلطان عبدالعزیز کے مہلک اسراف نے ایک کوڑی باقی نہیں رکھی تھی۔مَیں نے غیر معمولی محنت کر کے نئے بنک نوٹ جاری کر دئے۔

دستورِ اساسی کا اعلان

سلطان عبدالحمید نے تخت نشین ہوتے ہی دستورِ اساسی کا مسودہ ایک مجلس کے سپرد کر دیا تھا۔کہ اُس کی جانچ پڑتال کرے۔مجلس نے اُس پر پوری بحث کی، اور منظور کر کے سلطان کی خدمت میں بھیجدیا۔سلطان نے بھی اُس پر پسندیدگی کا اظہار کیا، اور ۷، ذی الحجہ ۱۲۹۳ھ میں بڑے تزک و احتشام کے ساتھ اُس کا اعلان ہوگیا۔تمام مملکت نے اس اعلان

کا پُرجوش استقبال کیا۔ پوری سلطنت میں جشن منایا جانے لگا۔

اس اثناء میں ہم نے دول یورپ کی مؤتمر کو صاف اور قطعی لفظوں میں اطلاع دے دی۔ کہ ہم اُس کی کوئی تجویز بھی منظور نہیں کریں گے۔ ہماری یہ جرأت نہایت خطرناک تھی۔ ہم نے گویا پورے یورپ کو دعوتِ جنگ دے دی تھی۔ مگر ہم مجبور تھے۔ ہماری مجلس وزراء نے طے کر لیا تھا۔ کہ خاموشی سے تباہ نہیں ہونگے۔ اگر مٹنا ہی ہے۔ تو عزت کے ساتھ مٹیں گے۔ دول یورپ ہمارا انکار سن کر بہت برہم ہوئیں، اور اپنے اپنے سفراء واپس بلا لیئے۔ اس کارروائی کا صاف مطلب یہ تھا۔ کہ ہمارے باہمی سیاسی تعلقات منقطع ہو گئے۔ مگر ہم نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی۔

دوسری طرف میں نے یہ کیا۔ کہ بلقانی ریاستوں سے براہِ راست گفت و شنید شروع کر دی۔ انہیں نرم گرم شرطوں پہ صلح کے لئے راضی کر لیا۔ ساتھ ہی دستورِ اساسی کے اعلان کے بعد ہم نے پہلی عثمانی مجلس (پارلیمنٹ) کے لیئے انتخابات شروع کر دیئے۔

ہم یہ سب کچھ کر رہے تھے، مگر چونکہ روس کی طرف سے اعلانِ جنگ کا قوی احتمال تھا۔ اس لیئے جنگی تیاریوں سے بھی غافل نہیں تھے۔ فوجوں کی تربیت اور نقل و حرکت تمام مملکت میں شروع ہو گئی تھی۔

مدحت پاشا کی جلاوطنی

سلطنت ان داخلی اور خارجی مشکلات میں پھنسی ہوئی تھی۔۔۔ میں

اصلاحِ حال کی شب و روز کوشش کر رہا تھا۔ کہ اچانک ایک دن قصرِ طوما
باغچہ میں سلطان نے مجھے طلب کیا۔ جوں ہی مَیں پہنچا، مجھ سے قلمدانِ وزارت
لے لیا گیا، اور کہا گیا۔ کہ مَیں جہاز عزالدین میں فوراً سوار ہو جاؤں۔ کیونکہ
سلطان کے حکم سے جلا وطن کر دیا گیا ہوں۔ مجھے یورپ چلا جانا چاہئے!
سلطان مراد کی تخت نشینی کے دن سے مَیں نے اِس قدر محنت کی تھی
کہ مجھے یقین ہے، کوئی دوسرا انسان نہیں کر سکتا۔ مَیں نے لگاتار جدّو
سے اب ایسی صورتِ حال پیدا کر دی تھی۔ کہ سلطنت تمام خطروں سے
صحیح و سالم نکل جاتی۔ لیکن اب اچانک یہ معاملہ پیش آگیا۔ پہلے مجھے خوشی
ہوئی۔ کہ اب آرام کر سکوں گا۔ مگر فوراً اِس خیال سے دل و جگر مجروح
کہ میری زندگی، میری نہیں۔ بلکہ قوم و ملک کی ہے، اور اس کے لئے سخت
خطرات درپیش تھے۔ مجھے یقین تھا کہ سلطان کی یہ حرکت، سلطنت کے لئے
نہایت مہلک ثابت ہو گی۔ اور اصلاح کی تمام امیدیں ضائع ہو جائیں
مَیں نے اپنا قصور دریافت کیا۔ سعید پاشا، سلطان کے پاس گئے
واپس آکر کہا۔ کہ دستورِ اساسی کی دفعہ ۱۱۳ کی رُو سے سلطان کو حق
ہے۔ کہ ہر اُس شخص کو جلا وطن کر دیں، جسے پولیس کا افسرِ اعلیٰ سلطنت
لئے خطرناک ظاہر کرے۔ ساتھ ہی انہوں نے دوسرکاری کاغذ بھی دکھا
ایک میں لکھا تھا۔ کہ پولیس نے ایک فوجی افسر کو بازار میں کہتے سنا
"مدحت پاشا عنقریب ترکی جمہوریت کا صدر منتخب ہو گا۔"
مَیں جلا وطنی کی اِس وجہ پر اپنی بے اختیارانہ ہنسی ضبط نہ کر سکا۔ سعید

نے کہا "سلطانِ معظم، سلام کے بعد فرماتے ہیں۔ کہ عنقریب تمہیں واپس بلا لیا جائے گا۔"

میں نے کہا "سلطان کے سلام کا شکریہ! مگر سلطان کو میرا یہ پیغام پہنچا دو۔ کہ اپنی واپسی پر میں ان محلوں میں سلطان کو نہیں پاؤں گا۔ اور نہ سلطنت کی یہ عظمت و شان نظر آئے گی۔ اس وقت میں تباہی روک نہ سکوں گا!" میں نے یہ کہا اور روانہ ہوگیا۔

"میری ناگہانی جلا وطنی سے پایۂ تخت اور صوبوں میں سخت بے چینی پیدا ہوئی۔ لوگ ڈرے کہ اب دستورِ اساسی بھی باطل ہو جائے گا کیونکہ میں نے ہی اُسے مرتب کیا تھا، اور سب سے زیادہ میں ہی اُس پر زور دے رہا تھا۔ یہ بے چینی دیکھ کر سلطان مجبور ہوئے۔ کہ نئی نئی تہمتیں تراشی جائیں۔ چنانچہ قسطنطنیہ کے اخبارات میں شائع کیا گیا۔ کہ میرے کاغذات میں ایسی چیزیں ملی ہیں۔ جن سے میری خیانت ثابت ہوتی ہے۔ اس لئے سلطان نے مجھے معزول کر کے جلا وطن کر دیا ہے!

اُس وقت تک ترک اس قدر نیک دل تھے۔ کہ سرکاری افترا پردازیاں سمجھ نہیں سکتے تھے۔ اس لئے اکثر لوگ میرے مخالف ہو گئے۔ مگر یورپ کے اخبارات حقیقتِ حال سے واقف تھے۔ انہوں نے صحیح خبر شائع کر دی۔ کہ چونکہ مدحت پاشا نے سلطان کی غلامی منظور نہیں کی، اس لئے اُن پر عتابِ شاہی نازل ہوا ہے۔ ترکوں نے یہ سُنا۔ تو سلطان پر نہایت برہم ہوئے۔ اب قصرِ شاہی مجبور ہوا۔ کہ میرے خلاف ایک پوری سازش

طیار کرے۔ چنانچہ آستانہ کے اخبارات اور ساقط مقرروں اور شاعروں کو رشوت دے کر آمادہ کیا گیا کہ مجھ پر حملہ شروع کر دیں۔ میں نے ترکی اخبارات دیکھے تو ہنسنے لگا۔ کل تک یہ میرے تدبر و دیانت کے راگ گاتے تھے۔ آج مجھے شیطان قرار دینے لگے۔ اُس وقت بے اختیار میری زبان پر یہ آیت جاری ہوا:۔ اذا اراد اللہ بقوم سوءا فلا مرد لہ وما لھم من دونہ من وال

روس کا اعلانِ جنگ

میری جلا وطنی کی خبر پیٹرزبرگ (دارالحکومت روس) پہنچی۔ تو حکومت میں مسرت سے اُچھل پڑی اب اُس نے باب عالی پر زور دینا شروع کیا۔ کہ بلقان کے متعلق اُس کے مطالبات منظور کر لے۔ لیکن ترکی حکومت نے انکار کیا۔ اِس پر روس نے اعلانِ جنگ کر دیا، اور دریائے طونہ کی طرف سے روسی فوج حملہ آور ہو گئی۔

اب سخت پریشانی پیدا ہو گئی۔ ہمارا خزانہ بالکل خالی پڑا تھا۔ میرے جاری کئے ہوئے بینک نوٹ، سلطان نے بے پروائی سے خرچ کر ڈالے تھے۔ نئے نوٹوں کا شائع کرنا سرِ دست ناممکن تھا۔ اعلانِ جنگ نے سابق نوٹوں کی قیمت بھی کم کر دی تھی۔ حکومت کے لئے اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ رعایا سے زبردستی روپیہ وصول کیا جائے۔ چنانچہ یہی کیا گیا۔

اس سے بھی بڑی مصیبت، سلطان کی ناتجربہ کاری تھی جنگ شروع

ہوتے ہی سلطان نے عبدی پاشا اور ردیف پاشا کو معزول کر دیا۔ یہ دونو سپہ سالار روسی سرحدوں سے واقف تھے۔ اور اس جنگ کے لئے پہلے ہی سے نقشے مرتب کر چکے تھے۔ ان کی معزولی نے میدانِ جنگ میں سخت ابتری پیدا کر دی۔ اس وقت ہماری جنگی قوت کافی تھی۔ ۵ لاکھ نظامی فوج نہایت عمدہ طور پر مسلح موجود تھی۔ رضاکاروں کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی مگر سلطان کی شخصی مداخلت نے معاملہ خراب کر دیا۔ رضاکار فوجیں منتشر کر دی گئیں۔ نظامی فوجوں میں بدنظمی پیدا ہوگئی۔ اس پر بھی سلیمان پاشا نے دشمن کی یلغار روک دی، اور امید بندھی کہ یہ دونوں سپہ سالار سلطنت کو خطرہ سے بچالیں گے۔ مگر کوئی جنگی مرکز موجود نہ تھا۔ مختلف مقامات سے احکام صادر ہوتے تھے۔ ہر مقام میں سلطان کی ضد موجود تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سلیمان پاشا کی فوجیں بھاگنے لگیں۔ اور عثمان پاشا، پلونہ میں قید ہوگئے۔ پلونہ میں روس کی پوری قوت موجود تھی۔ خود زار روس فوج کی قیادت کر رہا تھا۔

روس کو کامل فتح حاصل ہوگئی۔ اور اس کی مظفر و منصور فوجیں سین استفانو (مضافات قسطنطنیہ) تک پہنچ گئیں۔ دوسری طرف سے انگریزی حکومت کا جنگی بیڑہ، باسفورس میں آگیا۔ اور قصرِ شاہی کے سامنے توپیں سیدھی کرکے کھڑا ہوگیا۔

میں اس وقت یورپ میں اپنی جلاوطنی کے دن گزار رہا تھا۔ مجھے سلطنت کے معاملات میں مداخلت بادولِ یورپ سے گفت و شنید

کا کوئی حق نہ تھا۔ تاہم میرا دل یہ تباہی دیکھ کر بے چین ہوگیا۔ اور میں نے جد و جہد شروع کر دی۔ لندن، پیرس، وائنا، برلن، تمام مراکز میں پھرا اِس سعی کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ سین اسٹفانو کا ذلیل معاہدہ منسوخ ہوگیا۔ اور سلطنت ایک مرتبہ پھر بچ گئی۔ مجھے وزراء سلطنت اور خود سلطان کی غفلت پر از حد افسوس ہے۔ عین اُس وقت جبکہ روس پلونہ کا محاصرہ کئے پڑا تھا۔ میں نے آسٹریا کو راضی کر لیا تھا۔ کہ روس پر حملہ آور ہو جائے آسٹریا کے حملے کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہ ہوتا۔ کہ روسی فوجوں پر واپسی کا راستہ مسدود ہو جاتا۔ اور سب کی سب یا تو قید ہو جاتیں، یا برباد ہو جاتیں میں نے فوراً سلطان کو مفصل تار دیا۔ مگر بیس دن گزر گئے۔ اور کوئی جواب نہ آیا۔ اس اثنا میں رُوس کو کامل فتح حاصل ہوگئی تھی!۔"

میری اِن خدمات کا اثر، سلطان پر پڑا۔ انہوں نے مجھ بے گناہ کو انتہائی رحم و کرم سے معاف کر دیا۔ دو سو پونڈ ماہوار کا وظیفہ مقرر کیا۔ ایک ہزار پونڈ انعام دیا۔ ۵۰۰ پونڈ میرے بیوی بچوں کو مرحمت کئے۔ اور مجھے اجازت دی۔ کہ اپنے خاندان کے ساتھ جزیرہ کریٹ میں رہوں۔ چنانچہ یکم شوال ۹۵ھ میں میرا خاندان کریٹ پہنچ گیا۔

شام کی گورنری

لیکن دو ہی مہینے بعد مجھے فرمانِ شاہی ملا۔ کہ تم شام کے گورنر مقرر کئے گئے۔ میں معاہدہ کی تہ تک پہنچا ہوا تھا، دراصل سلطان مجھے پایۂ تخت

سے دُور رکھنا چاہتے تھے۔ مَیں نے معذرت کی۔ بڑھاپے کا عذر پیش کیا۔ مگر مسموع نہ ہوا۔ اور شام جانا پڑا۔ مجھے اِس منصب سے خوشی ہوئی۔ اس لئے نہیں کہ مناصب کی طلب تھی۔ اب مَیں مناصب سے اُکتا سا گیا تھا۔ اِس لئے کہ شام میں مَیں اپنا جنون اصلاح پُورا کر سکوں گا۔ میرا جنون، میری اصلاح پسندی ہے۔ مَیں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔

شام میں آتے ہی مَیں نے محسوس کیا کہ مسلمان باشندوں میں تعلیم بالکل مفقود ہے۔ چنانچہ مَیں نے تعلیم کی اشاعت، تمام اصلاحات پہ مقدم رکھی اور سینکڑوں مدرسے جاری کر دیئے۔ مَیں نے ایک قانون بنایا۔ کہ ، برس کی عمر کے بعد جو کوئی اپنے لڑکے کو مدرسے میں داخل نہیں کرے گا۔ اُسے سزا دی جائے گی۔ اِن مساعی کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ بہت جلد تعلیم کی طرف باشندوں کو رغبت پیدا ہوگئی۔ اور ہزار ہا بچّے پڑھنے لکھنے لگے۔ حالانکہ مجھ سے پہلے اس صوبے میں صرف گنتی کے چند مکتب قائم تھے۔ اور اُن میں بھی صرف قرآن پڑھایا جاتا تھا۔

از سرِ نو سازشوں کا ظہور

تعلیم کے بعد مَیں نے دوسری اصلاحات شروع کیں۔ مگر اچانک دارالخلافہ میں میرے خلاف از سرِ نو سازشوں کا ظہور ہو۔ سلطان نے داماد محمود پاشا اور رشدی پاشا وغیرہ کو جلا وطن کر دیا۔ جو سعی اصلاح میں میرے ہم خیال تھے۔ اور محمود ندیم پاشا اور جودت پاشا کو اپنا مشیر بنالیا۔ جو اصلاح

اور اصلاح پسند جماعت کے سخت دشمن تھے۔ پارلیمنٹ بند کر دی دستور اساسی منسوخ کر دیا۔ پھر خود میرے متعلق، آستانہ کے اخبارات نے لکھنا شروع کیا۔ کہ مَیں شام میں بغاوت کی تیاریاں کر رہا ہوں عنقریب اپنی بادشاہی کا اعلان کر دونگا۔ مَیں اس کی بھی پروا نہ کرتا، لیکن شام میں میری اصلاحات کی مخالفت پایۂ تخت سے ہونے لگی۔ اب مَیں نے دیکھا کہ استعفا پیش کر دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ چنانچہ اپنی پیری اور ضعیفی کی بنا پر استعفٰے دے دیا۔ بڑی حجتوں کے بعد سلطان نے اُسے منظور کیا لیکن حکومت کی خدمت سے مجھے علیحدہ ہونے نہیں دیا۔ شام سے سمرنا کی گورنری پر بھیجدیا۔

سمرنا میں اصلاحات و ترقی

اُس وقت صوبہ سمرنا کی حالت نہایت زبوں تھی۔ کوئی انتظام نہ تھا۔ ہر طرف لوٹ مار اور بے امنی پھیلی ہوئی تھی۔ مَیں نے از سرِ نو حکومت قائم کی۔ مدرسے جاری کئے۔ سڑکیں بنائیں۔ ٹریم جاری کی۔ مگر دارالخلافہ میں میرے خلاف برابر سازشیں جاری تھیں۔ محمود ندیم پاشا برسرِ اقتدار تھا۔ اور روس کے اشاروں پر کام کر رہا تھا۔

اب سلطان عبدالحمید بالکل کھل کھیلنا چاہتے تھے۔ جن جن لوگوں سے اُنہیں مخالفت کا ذرا بھی اندیشہ تھا سب کو پایۂ تخت سے جلا وطن کر دیا گیا تھا۔ مگر اس پر بھی وہ مطمئن نہ تھے۔ اِس اثنا میں معزول سلطان مراد

کا جنون دُور ہو چکا تھا۔ سلطان عبدالحمید کو اندیشہ پیدا ہوا۔ مبادا اُنہیں دوبارہ تخت نشین کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ چنانچہ انہوں نے تمام اصلاح پسندوں کا خاتمہ کر دینا چاہا۔

مدحت پاشا کے خلاف مقدمہ

اس مقصد کے لئے سلطان عبدالحمید نے مرحوم عبدالعزیز کی خودکشی کو آلۂ کار بنایا۔ عبدالعزیز کی وفات، ایک سازش اور قتل کا نتیجہ قرار دی گئی۔ ایک برس تک خفیہ طیاریاں ہوتی رہیں۔ پھر اچانک داماد محمود جلال الدین پاشا، رشدی پاشا، سردار عبدی پاشا، ردیف پاشا اور شیخ الاسلام خیر الدآفندی جلاوطن کر دئے گئے۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ تحقیقات سے ثابت ہو گیا ہے۔ کہ انہی لوگوں نے سلطان عبدالعزیز کو قتل کیا ہے۔ مگر وہ تحقیقات آجتک شائع نہیں کی گئی۔

اس اثنا میں میرے بعض دوست مجھے لکھ رہے تھے۔ کہ عنقریب تم بھی گرفتار ہونے والے ہو۔ فوراً بھاگ جاؤ۔ نیز میرے ایک یورپین دوست نے آکر کہا۔ میں ایک جہاز خاص تمہارے لئے لایا ہوں۔ فوراً یورپ چلے جاؤ۔ ورنہ گرفتار ہو جاؤ گے۔ مگر مَیں نے قطعی انکار کر دیا۔ مَیں نے کہا سلطان عبدالعزیز نے خودکشی کی ہے۔ نہ مَیں نے اور نہ کسی اور نے اُنہیں قتل کیا ہے۔ جب مَیں مجرم ہی نہیں ہوں۔ تو کیوں بھاگوں اور دشمنوں کو تہمت لگانے کا موقعہ دوں؟ مَیں نے ۴۰ برس سلطنت

کی خدمت کی ہے۔ اب آخری وقت میں اُسے چھوڑ نہیں سکتا!

میں نے یہ کہا۔ حالانکہ میں خوب جانتا تھا۔ کہ سلطان میرے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ اور جلد سے جلد میرا فیصلہ کر دینا چاہتے ہیں مجھے ہر روز اپنی گرفتاری کا انتظار رہتا تھا۔ چنانچہ ۴ مارچ کو جبکہ میں سمرنا کے دارالحکومت میں اپنے خاندان کے ساتھ سو رہا تھا۔ آدھی رات کے وقت مکان کا ۳ پلٹنوں نے محاصرہ کر لیا، اور مجھے قید کر کے آستانہ بھیج دیا گیا۔

خطوط

مدحت پاشا کے وہ خطوط جو اس نے قید خانۂ طائف سے اپنے عزیزوں کے نام بھیجے تھے

(۱)

آج بچوں کی تصویریں پہنچیں۔ میں نے تمہارے خطوں کے جواب بھیج دئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے۔ نہیں ملے۔ کیونکہ تم نے اُن کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔

سمرنا سے مجھے استنامبول لے گئے۔ وہاں قصر یلدز میں مجھے، اور محمود پاشا اور نوری پاشا کو علیحدہ علیحدہ حجروں میں قید کر دیا۔ مجھ سے کہا گیا۔ کہ تحقیقات سے ثابت ہو گیا ہے۔ سلطان عبدالعزیز نے خودکشی نہیں کی ہے بلکہ سلطان مراد اور اُن کی والدہ کے اشارے سے محمود پاشا اور نوری

پاشا نے اُنہیں قتل کرایا ہے۔ اور یہ کہ خود مَیں خیراللہ آفندی، اور رشدی پاشا بھی اِس قاتلانہ سازش میں شریک ہیں۔ پھر کہا گیا۔ کہ مصطفٰے پہلوان، حاجی محمد، مصطفٰے جزائری، سلطان عبدالعزیز کے تینوں خادم اصلی قاتل ہیں، حالانکہ یہ سب جھوٹ ہے۔ کیونکہ یہ تینوں شخص، عبدالعزیز کی وفات کے وقت نظربند تھے۔ اگر بفرضِ محال عبدالعزیز کو کسی نے قتل ہی کیا ہو۔ تو کسی حال میں بھی میرے یا رشدی پاشا کے خلاف شبہ کرنے کی کوئی وجہ موجود نہیں۔ سلطان کی وفات کے وقت اُن کی والدہ اور تین سو بیویاں اور کنیزیں محل میں موجود تھیں۔ پانچ برس گزر گئے، مگر آج تک انہوں نے کبھی اشارۃً کنایتہً بھی نہیں کہا۔ کہ سلطان قتل کئے گئے ہیں۔

مَیں نے محلِ شاہی میں نام نہاد عدالت کے سامنے پوری تفصیل سے تمام واقعات بیان کئے۔ تمام ججوں کو مجبوراً تسلیم کرلینا پڑا۔ کہ واقعی کوئی ثبوت قتل کا موجود نہیں، بلکہ یہ میرا سراسر بہتان ہے۔ مگر چونکہ سلطان عبدالحمید "خطرناک" لوگوں سے چھٹکارا حاصل کرنے پر کمربستہ تھے۔ اس لئے عدالت نے ۱۱- آدمیوں کو زبردستی مجرم قرار دے کر بے رحمانہ سزائیں دے دیں۔ عدالت کے بعض ایماندار ارکان نے آخر وقت تک اس فیصلہ میں شرکت سے انکار کیا۔ سلطان نے اُن کی ایمانداری کی بھی پوری قدردانی کی اور ہماری طرح وہ بھی قید خانے بھیج دیئے گئے!

سلطان سے میری کوئی ملاقات نہیں ہوئی۔ بعض مصاحب ہر تیسرے دن میرے پاس سلطانی پیغام لے کر آتے تھے۔ اور طفل تسلیاں دے

جاتے تھے ۔ ایک دن یہ پیغام پہنچا ۔ کہ سلطان کو میری اس مصیبت کا نہایت قلق ہے ۔ میری جلا وطنی پر وہ انتہائی افسوس کے ساتھ مجبور ہو گئے ہیں ۔ لیکن پوری ہمدردی سے مجھے اجازت دی ہے ۔ کہ اپنا خاندان اپنے ساتھ رکھ سکتا ہوں! " نیز مجھے اذنِ شاہی حاصل ہوا ۔ کہ اپنے عزیزوں کو اگر چاہوں خط لکھ دوں ۔ مَیں نے خطوط لکھ کر دے دیئے ۔ مگر افسوس ہے ۔ کہ وہ تم لوگوں تک نہیں پہنچائے گئے ۔

مجھے یقین تھا ۔ کہ روڈس یا عکّا کو جلا وطن ہو رہا ہوں ۔ میرے خادم عارف کو افسروں نے جہاز کے ایک کمرے میں قید کر دیا ۔ میرے پاس پہننے کا ایک کپڑا بھی نہیں تھا ۔ حتیٰ کہ رات کا لباس بھی موجود نہ تھا ۔ جو کپڑے میرے بدن پر تھے ، وہی پہنے رہا ۔ اتفاق سے ایک دن مَیں نے خادم کو دیکھ لیا ۔ اُس کے پاس میرے رات کے پہننے کا کرتا موجود تھا ۔ وہ مَیں نے پہن لیا ۔ اور بدن کے کپڑے اُتار کر خود اپنے ہاتھ سے دھوئے ۔ اور اس وقت تک کمرے میں چھپا بیٹھا رہا ۔ جب تک کپڑے سوکھ نہ گئے ۔ اَب دُنیا سے مجھے نفرت ہو گئی ہے ۔ اور چاہتا ہوں ۔ جلد اپنے پروردگار کے سامنے پہنچ جاؤں!

ہم تمام رفقائے مصیبت جہاز "عزالدین" پر سوار کر دیئے گئے ۔ کچھ نہیں معلوم تھا ۔ کہاں جا رہے ہیں؟ محمود پاشا کو ایک نہایت غلیظ کمرے میں رکھا گیا ۔ نوری پاشا اور مَیں بھی ایسے ہی کمروں میں اُتارے گئے ۔ پھر دروازوں پر قفل چڑھا دئیے گئے ۔

ہم جدہ پہنچے ۔ بحر احمر کی گرمی بہت ہی سخت ہوتی ہے ۔ ہماری تندرستی

کو بہت نقصان پہنچا۔ ہمارے کمرے پاخانوں کے قریب تھے۔ بدبو سے دماغ پھٹا جاتا تھا۔ نوری پاشا تو جہاز ہی میں پاگل ہو گئے تھے۔ اب تک اُن کا دماغ درست نہیں ہوا۔"

جدہ پہنچتے ہی ہم سمجھ گئے۔ کہ طائف میں قید ہونا ہے۔ مگر ہم باہم کوئی گفتگو نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ ہر ایک کے ساتھ آٹھ آٹھ مسلح سپاہی تھے۔ اور بولنے کی سخت ممانعت تھی۔ ہم سے ازحد ذلت کا برتاؤ کیا گیا۔ کشاں کشاں مکہ معظمہ پہنچے اور حرم شریف کے قریب بعض کمروں میں قید کر دیئے گئے۔ ہم خاص مسجد کعبہ میں موجود تھے۔ مگر ایک مرتبہ بھی ہمیں زیارت کی اجازت نہیں دی گئی!۔

ہم طائف پہنچے۔ اور قلعہ کے قید خانہ میں علیحدہ علیحدہ کوٹھڑیوں کے اندر قید کر دیئے گئے۔ ہر کمرے کے سامنے ننگی تلواریں لئے سپاہی کھڑے رہتے ہیں۔ باہم گفتگو کی سخت ممانعت تھی، مگر اب اُٹھ گئی ہے۔ کیونکہ پاسبانوں نے دیکھا، اس پابندی کی تعمیل ممکن نہیں۔

سلطان کا فرمان، شریف مکہ کو پہنچا۔ کہ یہ لوگ (یعنی ہم) جلا وطن ہیں۔ اندیشہ ہے بھاگ جائیں گے۔ پوری سختی سے نگرانی ہونی چاہیے۔ یہ حکم پاتے ہی شریف نے کمروں کے روشندانوں کو بھی بند کرا دیا۔ اور ہمارے پیروں میں لوہے کی بیڑیاں ڈال دیں۔ مگر اب بیڑیاں کاٹ دی گئی ہیں۔ کیونکہ بیماری نے ہمیں اس قابل ہی نہیں رکھا۔ کہ یہ بوجھ برداشت کر سکیں۔

خوش قسمتی سے ایک شریف آدمی کی ہمدردی حاصل ہو گئی ہے۔ یہ

ہمارے خطوط تم تک پہنچایا کرے گا۔ پچھلے خطوط، جو تمہیں ملے، اسی کے ذریعے بھیجے گئے تھے۔ جب میں نے اپنے رفیقوں کو اطلاع دی کہ میرے اور اُن کے خطوط، منزلِ مقصود پر پہنچ گئے۔ تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے کیونکہ ہر ایک کے بچے ہیں، اور اُن کی ملاقات کی تمنا رکھتے ہیں۔ اگر ہم نے جرم کیا ہوتا۔ تو اس خیال سے دل کو تسکین دے سکتے، کہ یہ ہمارے جرم کی سزا ہے، لیکن ہم نے تو کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ اگر یہی جرم ہے، تو افسوس اُس ملک پہ جہاں اصلاح و ترقی جرم سمجھی جائے!۔

میرے رفقاء، انتہائی غم والم میں ہیں۔ یہ بالکل قدرتی بات ہے لیکن میری حالت [illegible] ہے۔ میں اب ۶۰ برس سے تجاوز کر چکا ہوں۔ اس عمر کا آدمی کتنے برس اور جی سکتا ہے؟ تمہیں یاد ہوگا، کہ گزشتہ سال ہی سے میرا عزم تھا کہ خلوت کی زندگی اختیار کر لوں۔ سفرِ آخرت کی تیاری میں باقی دن گزار دوں۔ معلوم ہوتا ہے۔ خدا نے یہ اُسی کا سامان کر دیا ہے!۔

مدت سے تمنا تھی۔ کہ ذہن کو تلاوتِ قرآن میں مشغول کر دوں۔ مگر فرصت نہیں ملتی تھی۔ اب الحمدللہ پوری مہلت مل گئی۔ اور میں نے "قد سمع اللہ" تک قرآنِ مجید از سرِ نو حفظ کر لیا ہے۔ میں نماز کی بھی پوری پابندی کرتا ہوں۔ شب و روز یادِ خداوندی میں مصروف رہتا ہوں۔ آیت "ما اصاب من مصیبۃ الا باذن اللہ و من یومن باللہ، یہد قلبہ" ہر لمحہ میرے پیشِ نظر رہتی ہے۔ مجھے اِس سے بڑی ہی تسکین حاصل ہوتی ہے۔ اپنے رب پر متوکل ہو گیا ہوں۔ اپنے تئیں اُسی کے حوالے کر دیا ہے۔ تم بھی یہی کرو۔ اُس

پر توکل کرو۔ اور اُس کے سپرد ہو جاؤ!

اگر مجھے کوئی رنج ہے، تو وہ تمہاری اور بچوں کی جدائی کا ہے۔ خداوند جل و علا سے دعا ہے۔ ہم سب کو پھر جمع کر دے۔ میرے مصنوعی دانت ٹوٹ گئے۔ یہاں اُن کی مرمت کرنے والا کوئی نہیں۔ کھانے میں اب مجھے ناقابلِ برداشت تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میں نے تمباکو طلب کی تھی ابھی تک نہیں پہنچی۔ نیز لکھا تھا۔ کہ تفسیرِ بیضاوی، تفسیر روح البیان، اور وہ زرد رنگ کی فرانسیسی کتاب بھیج دو۔ جسے میں اکثر پڑھا کرتا تھا۔ یہ سب کتابیں، سمرنا میں موجود ہیں۔ اگر بھیج سکو۔ تو روانگی میں دیر نہ کرنا۔

یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی۔ کہ بچوں کی تعلیم پر پوری توجہ کر رہی ہو۔ علی حیدر، وسیمہ، صابرہ کو بہت بہت پیار کرو۔ دریۂ ہانم کو اور تمام ملازموں کو سلام۔

سمرنا میں دو صندوق، ساحلی کمپنی کے منیجر کے پاس چھوڑ آیا تھا۔ ان میں میرے تمغے اور اعزازی سندیں ہیں۔ تاکید کر دی تھی۔ کہ تمہیں دے دے۔ معلوم نہیں۔ ان کا کیا حشر ہوا؟ اگر صندوق اب تک اسی خائن کے پاس ہیں۔ تو مجھے لکھو۔ تاکہ اُسے یاد دہانی کر دوں"

(۲)

"رمضان کے بعد کوئی خط نہیں ملا۔ تمہارے اور بچوں کے حالات نہ معلوم ہونے سے سخت قلق اور ملال ہے۔ تم نے ضرور روپیہ اور کھانے

کی چیزیں بھیجی ہوں گی۔ مگر مجھے کچھ نہیں پہنچا۔ مجھے روپیہ کی ازحد ضرورت ہے۔ کیونکہ پچھلے سال جو ۵۰ پونڈ بھیجے تھے، اور جو رقم قسطنطنیہ سے آئی تھی۔ اب اس میں سے کچھ بھی باقی نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ پہلے حکومت نے ہمارے کھانے پینے کا ذمہ خود لے رکھا تھا۔ مگر اب وہ کسی کو کچھ نہیں دیتی۔ ہمیں اپنی روٹی خریدنا پڑتی ہے۔ ہمارے ساتھ بعض ایسے قیدی بھی ہیں جن کے پاس ایک پیسہ نہیں۔ میں اور محمود پاشا اُن کی کفالت کر رہے ہیں۔ انہیں کپڑے بھی بنا دیتے ہیں۔ ہمیں قید خانے کے نوکروں کا بھی خیال کرنا پڑتا ہے۔ یہ لوگ محض ہماری وجہ سے یہاں رکھے گئے ہیں۔ اِن حالات کی بنا پر ہمیں روپیہ کی سخت ضرورت ہے۔

ہمارے رفقاء میں فوج کے بعض بڑے بڑے افسر بھی ہیں انہوں نے ہم سے کچھ روپیہ قرض لے کر کپڑا خرید لیے۔ بیچارے خود اپنے ہاتھ سے سی رہے ہیں۔ اُن کی مصیبت اسی پر ختم نہیں ہو جاتی۔ ان کے لئے ایک خشک روٹی کا بھی انتظام نہیں کیا گیا ہے۔ بعض مجبوراً روزہ رکھتے ہیں۔ ہم پر فرض ہے کہ اُن کی ضروریاتِ زندگی کا حتی الوسع خیال رکھیں ہر ملک میں دولتمند، غریبوں کی دستگیری کرتے ہیں۔ لیکن یہاں ان مسکینوں کے لیے اس قسم کا کوئی موقع موجود نہیں ہے۔ انسانیت کا تقاضا ہے۔ کہ ہم ہی اِن کی خبر لیں۔ لہذا فوراً ۵۰ پچاس پونڈ حکومت کے توسط سے بھیج دو۔ اگر فوراً روپیہ نہ آیا۔ تو میں اپنا پانی کا برتن اور گھڑی بیچنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ اس صورت میں لوگ بہت قیل وقال کریں گے۔ اور ہمارے

ذہن کو تشویش ہو گی

بچوں کو پیار

مدحت

قلعہ طائف کا قیدخانہ

۲۵ راگست ۱۹۲۵ء

(۱۱۳)

. . . پرسوں یہاں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ شریف مکہ (عبدالمطلب) حسب عادت آجکل طائف میں موجود تھے۔ منگل کی رات کو وہ اپنے گھر میں مطمئن سو رہے تھے کہ اچانک آدھی رات کو تین فوجیوں نے آکر اُن کا محل گھیر لیا۔ فوج کے ساتھ ہم توپیں بھی تھیں۔ صبح ہم کیا دیکھتے ہیں کہ شریف اپنے رات کے کپڑوں میں ہمارے قید خانے میں قیدی بنے چلے آرہے ہیں۔

کہا جاتا ہے۔ شریف کا جرم یہ ہے کہ اُس نے انگریزوں سے سازش کرنی چاہی تھی۔ اِس شخص نے ہمیں محض سلطان کے خوش کرنے کے لئے بہت تکلیف پہنچائی تھی۔ خدا نے اس کا بدلہ لے لیا۔ وہی مصیبت اُس پر ڈال دی جس میں ہم پھنسے ہیں۔ اِس میں ہر عاقل کے لئے عبرت ہے لیکن مجھے اِس شخص پر بہت ترس آتا ہے۔ سو برس کا بوڑھا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذریت میں سے ہے۔ یہ واقعہ بالکل ویسا ہی ہے۔ جیسا ہمیں سمرنا میں پیش آیا تھا۔ فرق صرف اِس قدر ہے کہ وہاں توپوں کی تعداد زیادہ تھی

"مدحت"

(۴)

"گزشتہ رمضان سے تمہاری اور بچوں کی کوئی خبر نہیں ملی۔ میں نے بھی تمہیں اپنی مفصل حالت نہیں لکھی۔ کیونکہ نہایت ہی سخت تکلیف میں ہیں۔ آج پانچ مہینے ہوتے ہیں۔ کہ ہمارے خدمتگار ہم سے علیحدہ کر دیے ہیں۔ حال میں آستانہ سے عمر بک نام ایک شخص خاص اس غرض سے بھیجا گیا ہے۔ کہ اگر ہماری ایذا رسانی میں کچھ کمی رہ گئی ہو۔ تو پوری کر دے۔ اس شخص کی عمر زیادہ ہے۔ مگر عقل کم ہے۔ اس کے افعال ایسے ہیں جو کسی شریف الطبع آدمی کے نہیں ہو سکتے۔ یہ ہماری جان لینے پر تلا ہوا ہے۔ کیونکہ شاید اُسے یہی حکم ملا ہے۔ یا مزید مقبولیت اس ذریعہ سے حاصل کرنی چاہتا ہے اس کا خیال ہے۔ کہ ہمیں یہاں رکھنے سے ہم جلدی نہیں مریں گے۔ بلکہ ہماری زندگی بڑھ جائے گی۔ لہٰذا کوئی ایسی تدبیر نکالنی چاہتا ہے۔ جس سے میری، محمود پاشا کی، اور خیر اللہ آفندی کی زندگی جلد سے جلد ختم ہو جائے۔ وہ نوکروں سے کہتا ہے "تم ضرور وطن واپس جانے کے لئے بے قرار ہو گے لیکن جب تک یہ تمہارے آقا زندہ ہیں، تم واپس نہیں جا سکتے۔ ان کے قتل میں میری مدد کرو۔ تاکہ آزادی حاصل کر سکو۔ چنانچہ اس نے نوری پاشا کے خادم بکر آغا کو بلا کر کہا۔ "تم نوکروں کی قید اسی وقت ختم ہو گی جب یہ لوگ مریں گے۔ نوری پاشا تو مجنون ہیں۔ کئی دفعہ کمرے کی کھڑکی سے پھاندنا بھی چاہا۔ تم ان کی اس میں مدد کیوں نہیں کرتے؟ مجھ سے ریتی لو۔ اور کھڑکی کی سلاخ ریت ڈالو۔ تاکہ نوری پاشا پھاند کر ہلاک ہو

جائیں "

غرض کہ اس نے تمام نوکروں کو بھڑکانا شروع کر دیا ہے۔ نوکروں نے اس کی سازش میں شریک ہونے سے انکار کر دیا۔ اس پر انہیں بھی سخت تکلیفیں دی جا رہی ہیں۔ یہ خبریں سن کر ہم سخت پریشان ہیں۔ ہمیں زہر دینے کی پوری کوشش کی جا رہی ہے۔ ایک طرف دنیاوی منفعت حاصل کرنے کے لئے یہ شخص ہمیں مارنا چاہتا ہے۔ دوسری طرف آخرت کی ثواب کے لئے حج کرنے بھی گیا ہے۔ یہ سمجھتا ہے۔ کہ اس طرح دین اور دنیا، دونوں اُسے حاصل ہو جائیں گے!

ہم ڈیڑھ برس سے یہاں ہیں۔ مگر آج تک قلعہ کا پھاٹک تک دیکھ نہ سکے۔ عزیز ترین لوگوں سے بھی ملاقات کی اجازت نہیں ملی ہمارے پاس ایک اجنبی باورچی تھا۔ ڈرا دھمکا کر اسے بھی رخصت کر دیا گیا یہ حالات دیکھ کر ہمیں یقین ہوتا ہے۔ کہ ہمیں جلد اس دنیا سے کوچ کرنا ہو گا۔

اگر ہمارے ستانے اور اس طرح قفس میں بند رکھنے سے مقصود یہ ہے۔ کہ قصر شاہی کی سازش پر پردہ ڈالا جائے۔ تو یہ کوشش بے سود ہے۔ یورپ بھر میں اصلی حقیقت مشہور ہو چکی ہے۔ اخبارات کے صفحوں پر آ چکی ہے۔ لیکن اگر ہمیں تکلیف دے کر سلطان اور اُن کے مصاحب خوش ہوتے ہیں۔ تو ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ کہ احکم الحاکمین سے فریاد کریں۔ اور دعا مانگیں۔ کہ وہ اپنا فیصلہ جلد صادر کر دے۔ مگو تمہیں

کوئی منصف مزاج ملے۔ تو ہماری ناقابل بیان مصیبت کی یہ داستان سنا دینا۔

قید خانہ طائف ۵ محرم ۱۳۰۰ھ

(۵)

والئ حجاز عثمان پاشا کے نام

"آپ نے رسالہ دار محمد بیک کے نام جو خط لکھا ہے، اس میں شکایت کی ہے۔ کہ میں نے عمر پاشا کے افعال کی اطلاع انگریزی قونصل کو دی ہے حالانکہ میں نے قونصل مذکور کو ہرگز کوئی خط نہیں لکھا۔ بلکہ اس قسم کا کبھی وہم بھی پیدا نہیں ہوا۔ کہ اُسے اطلاع بھیجوں۔

عمر پاشا کی حرکتیں ایسی نہیں ہیں۔ کہ زیادہ دنوں تک مخفی رہتیں، طائف اور مکہ میں بچہ بچہ اُن سے واقف ہے۔ اگر انگریزی قونصل کو علم ہوا ہے۔ تو تاجروں اور عام باشندوں کے ذریعہ ہوا ہوگا۔

لیکن آپ نے دوسرے خط میں پھر مجھے اس معاملہ میں ملامت کی ہے بظاہر آپ کو یقین ہے۔ کہ اس میں میرا ہاتھ ضرور ہے۔ لہذا میں مجبور ہوگیا ہوں۔ کہ حقیقت ظاہر کر دوں۔

عمر پاشا علی الاعلان کہتے رہتے ہیں۔ کہ اُن کے آنے کی غرض، ہم قیدیوں کو زہر دے کر قتل کرنا ہے۔ صرف زبان ہی سے نہیں۔ بلکہ عمل سے بھی وہ اسے ثابت کرتے رہتے ہیں۔ انہوں نے کھلے بندوں نوکروں کو مشورہ دیا۔ کہ اپنے آقاؤں کو دن دہاڑے مار ڈالیں۔ نوکروں نے ایسا نہیں کیا

تو انہیں قید کر دیا گیا اور سخت تکلیفیں دی گئیں۔

اجانب کو اگر یہ شرمناک حالات معلوم ہو گئے ہیں۔ تو یہ کچھ عجیب نہیں ہے۔ انگریزی قونصلوں کا کام ہی یہ ہے۔ کہ خبریں معلوم کر کے اپنی حکومت کو مطلع کرتے رہیں۔ باہر ہمارا کوئی ایسا معتمد علیہ موجود نہیں جس پر ہم اس طرح کے معاملات میں بھروسہ کر سکیں۔ پھر کیسے یقین کیا جا سکتا ہے۔ کہ ہم نے انگریزی قونصل کو اطلاع پہنچائی ہوگی؟ ہمارے نوکر بھی آزاد نہیں ہیں۔ کہ ادھر ادھر جا سکیں۔ وہ ہفتہ میں صرف ایک مرتبہ قلعہ سے نکلتے ہیں۔ تاکہ ضروری اشیا بازار سے خرید لیں۔ اور اس وقت بھی مسلح افسروں کی حراست میں رہتے ہیں۔

نہیں معلوم تمہارے ضمیر نے یہ کیونکر گوارا کیا۔ کہ ہمیں ملامت کرو۔ تمہارے خیال میں اُن لوگوں کا کیا حال ہوگا۔ جو اپنی آزادی اولاد، احباب مال و متاع سب سے جیتے جی محروم کر دئے گئے ہیں، اور ایک قفص میں جانوروں کی طرح محبوس ہیں۔ وہ اپنے عزیزوں کی صحت بھی معلوم نہیں کر سکتے۔ یقیناً یہ ایسا برتاؤ ہے۔ جسے دُنیا کا کوئی قانون، کوئی شریعت، کوئی انصاف پسند انسان جائز قرار نہیں دے سکتا!

اگر یہ نئی تہمت تراشنے سے مقصود یہ ہے۔ کہ ہمارے عزیزوں سے خط و کتابت بھی موقوف کر دی جائے۔ تو وہ ہماری اس قید کی وجہ سے پہلے ہی سخت بد بختی میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ مرے کو مارنا کہاں کا انصاف ہے؟

تم نے اپنے خط میں لکھا ہے۔ کہ سمرنا میں ہیں میں نے فرانسیسی قونصل سے پناہ چاہی تھی۔ یہ حقیقت سے تمہاری جہالت کی دلیل ہے۔

میں صوبۂ سمرنا جیسے ایک بڑے صوبے کا حاکم تھا۔ اچانک ایک رات میرے گھر کا فوجوں نے محاصرہ کر لیا۔ مجھے قید کر کے لے چلے۔ میں اپنی عورتوں اور بچوں کا گریۂ وبکا اپنے کانوں سے سنتا تھا، مگر انہیں تسلی تک نہیں دے سکتا تھا۔ اس وقت میرے دل کی کیا حالت ہوگی؟ اس کا جواب میں خود تمہارے ضمیر سے چاہتا ہوں۔

اگر تم مجھے اس لئے ملامت کرتے ہو۔ کہ حکومت کی حرکتوں کو حق بجانب قرار دو، تو یہ کوشش بے فائدہ ہے۔ میں دو مرتبہ وزیر اعظم رہ چکا ہوں لیکن اس کے باوجود بھی مجھ سے یہ ذلت آمیز برتاؤ کیا گیا۔ اور بغیر کسی جرم کے قید میں ڈال دیا گیا۔

تم نے لکھا ہے تم ایسی باتوں کی اجازت دے نہیں سکتے۔ اور اب تم ہماری زبانیں بند کر دو گے۔ ہماری زبانیں اب بھی بند ہیں۔ معمولی افسروں اور سپاہیوں کی ہم پر حکومت ہے۔ ہم زبان ہلا نہیں سکتے۔ تم اس وقت اختیار رکھتے ہو۔ ہم بے اختیار ہیں۔ جو تمہارے دل میں آئے شوق سے کرو۔ ہمیں اعتراض کا بھی حق نہیں ہے۔ تم ہمیں مجرم کہتے ہو۔ ہم اس پر بھی معترض نہیں ہو سکتے۔ لیکن میں تمہیں وہ گفتگو یاد دلاتا ہوں۔ جو تم نے دارالحکومت میں مجھ سے کی تھی۔ تم نے انسانیت، مروت شرافت کا ذکر کیسا تھا۔ کیا یہ موجودہ برتاؤ اِن صفات کے

مطابق ہے؟ -

قید خانہ طائف ۱۷ صفر ۱۳۰۱ھ

(۶)

نعیمہ ہانم کے نام

. . . پچھلے دنوں مشہور کر دیا گیا۔ کہ مَیں ہندوستان یا یورپ بھاگ گیا ہوں - اخبارات کو یہ خبر شائع کرنے پر مجبور کیا گیا ہے تعجب یہ ہے کہ فرانس کے اخبار "طان" تک کو گمراہی میں ڈال دیا گیا - اور اس نے بذریعۂ تار آستانہ کے اخباروں سے دریافت کیا - اس سے پہلے یہ افواہ مشہور کی گئی تھی - کہ مَیں مجنون ہو گیا ہوں معلوم نہیں - کہ اس کذب و دروغ سے حکومت کو کیا فائدہ حاصل ہوتا ہے؟

طائف - ۲۳ صفر ۱۳۰۱ھ

(۷)

اپنے مرشد سلیمان آفندی کے نام

. . . . . قسمت میں یہی تھا - کہ ہم اپنے اہل و عیال اور مال و متاع سے جیتے جی دُور اور اپنی آزادی سے محروم ہو جائیں - ہم جس مصیبت میں گرفتار ہیں - اس کا تصوّر بھی کوئی نہیں کر سکتا - صرف ذاتِ الٰہی باقی رہے گی - کوئی مخلوق بھی دائمی زندگی نہیں پائے گی - سب کے لئے زوال ضروری ہے -

لا یغرن امرأً عیشہ   کل حی صائر للزوال

یہ چند روزہ زندگی، ایک کھیل ہے۔ بلکہ ایک پُل ہے۔ جس پر سے انسان گزر جاتا ہے۔ زندگی کی حرص و طمع، لاحاصل ہے۔ اِن مصائب پر اللہ تعالیٰ بندوں کا ثواب زیادہ کر دیتا ہے۔ ہمارے لئے انبیاء و اولیاء کا اسوۂ حسنہ موجود ہے۔ اِن میں اکثر قید خانوں ہی میں مرے۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام موسیٰ کاظم کی مثال ہر وقت میرے پیشِ نظر رہتی ہے۔

میری حالت اِس وقت یہ ہے کہ ہر لمحہ یہ مقولہ زبان پر رہتا ہے:

"کن فی الدنیا کانک غریب" (دنیا میں اس طرح رہو۔ گویا پردیس میں ہو) زندگی کے آخری مرحلے تک پہنچ چکا ہوں۔ عمر ۸۰ سے زیادہ ہو گئی ہے۔ اب مجھے ہر لمحہ حیات غنیمت سمجھنا چاہیئے۔ اور آخرت کی تیاری کرنی چاہیئے۔ میرے پاس بعض کتابیں موجود ہیں۔ اُن میں آپ کا مجموعۂ رسائل بھی ہے۔ اِس کتاب سے مجھے عبادتِ الٰہی میں بہت مدد ملتی ہے۔ لیکن انسان تنہا اپنی رائے سے ہر قسم کی ریاضت نہیں کر سکتا، لہٰذا اے شیخ جلیل! مَیں آپ سے درخواست کرتا ہوں۔ کہ میری اُس راستہ کی طرف رہنمائی کیجئے۔ جو خدا تک پہنچنے کا راستہ ہے۔ مَیں یہاں دُور سے بھی آپ کے ہاتھ کو بوسہ دیتا ہوں۔ کیونکہ معنوی، جسمانی اتصال کا محتاج نہیں۔ آپ مجھے تحریر کے ذریعہ ہدایت دیجئے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو۔ تو خود تشریف لائیے۔ اور زبانی رہنمائی کیجئے۔ مَیں بے صبری سے آپ کے تحریری یا زبانی جواب کا منتظر رہوں گا۔"

قید خانہ طائف

۱۹ شوال ۱۳۰۰ھ

(۸)

نعیمہ ہانم کے نام

"گزشتہ ماہ ایک خط "سعید بک" کے فرضی دستخط سے بھیج چکا ہوں۔ اس کے ایک ہفتہ بعد، دو پھوڑے نکل آئے۔ایک پیٹھ میں، دوسرا پہلو میں۔یہاں صرف ایک ڈاکٹر ہے۔اور وہ بھی نومشق ہے۔دوستوں کو میری بیماری سے سخت تشویش ہوئی۔انہوں نے میری لاعلمی میں والی مکہ کو تجربہ کار طبیب بھیجنے کے لئے لکھا۔مگر والی نے کوئی جواب نہیں دیا۔میں صاحب فراش تھا۔اور قصر سلطانی سے برابر احکام آرہے تھے۔کہ مجھے اور میرے رفقاء کو قتل کر ڈالا جائے۔چنانچہ ہمارا خاص موقوف کر دیا۔اور ہمارے نوکر بھی علیحدہ کر دیئے گئے۔میں بستر مرگ پر پڑا تھا۔ایک افسر نے آکر حکم پہنچایا "تمہیں بھی وہی کھانا ملے گا۔جو دوسرے تمام قیدیوں کو دیا جاتا ہے۔لہٰذا بازار سے کوئی چیز نہ خریدو۔تمہارے خاص برتن بھی لے لئے گئے۔قیدخانہ کے برتنوں میں کھاؤ پیو کپڑے بھی اپنے ہاتھ سے دھونا پڑیں گے!" پھر اس نے ہم سے کاغذ، قلم، دوات وغیرہ لکھنے پڑھنے کا تمام سامان بھی لے لیا اور چلا گیا۔

الحمدللہ میں نے تمہارے تمام خطوط پہلے ہی سے جلا دیئے تھے، ورنہ انہیں ایک اور بہانہ ستانے کا مل جاتا۔خیر اللہ آفندی کی بیوی اور دو برس کی عمر کا بچہ "قلعہ کے قریب ایک مکان میں تھے۔انہیں بھی نکال دیا گیا اس وقت یہ لوگ مکہ میں مقیم ہیں۔

اِس سختی سے حکومت کی غرض یہ ہے۔ کہ ہم جلد سے جلد مر جائیں کیونکہ ہم لوگ اچھے کھانوں کے عادی ہیں۔ قیدیوں کا کھانا کھاکر ضرور ہلاک ہو جائیں گے۔ صرف اسی قدر نہیں۔ بلکہ ہمیں ہر ممکن تکلیف بھی دی جا رہی ہے۔ کیونکہ حکومت کو شبہ ہے۔ کہ یہ لوگ قیدیوں کا کھانا کھانے پر بھی زیادہ دِن زندہ رہیں گے۔ جب سے میرے رفقاء نے یہ حکم سُنا ہے۔ نہایت پریشان ہیں۔ اور شب و روز اللہ تعالیٰ سے دعائیں کر رہے ہیں۔

اس مہلک بیماری میں مجھے آرام کی بہت زیادہ ضرورت تھی۔ مگر میرے خادم کو بھی لے گئے۔ اسی قدر نہیں بلکہ طبیعت کی آمدورفت بھی رُوک دی۔ اس سے بھی بڑھ کر افسر کی گستاخانہ گفتگو نے مجھے اذیت دی۔ میری بیماری بہت زیادہ ہوگئی۔ موت کا قطعی یقین تھا۔ دُنیا سے سفر پر مجھے ازحد خوشی تھی۔ لیکن افسوس، موت قسمت میں نہ تھی۔ زندگی کا معاملہ، صرف خدا ہی کے ہاتھ میں ہے۔ میری طلب پر بھی موت نہ آئی۔ میرے رفقاء نے ایک مرہم خود بناکر پھوڑوں پر لگا دیا تھا۔ وہ اُس سے پھوٹ گئے۔ ۱۵ دن میں زخم بھر گئے۔ اب میں پھر زندہ رہ گیا ہوں۔

افسر نے میرے خادم کو جدّہ بھیج دیا تھا۔ تاکہ آستانہ پہنچا دیا جائے مگر قصرِ شاہی سے حکم آیا۔ کہ اُسے وطن آنے نہ دیا جائے، بلکہ قید کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ غریب بھی قید ہے۔ اِس حادثہ سے مجھے بہت

رنج پہنچا۔ میں خوش تھا۔ کہ مسکین کو اب مصیبت سے نجات ملی مگر میری خوشی، صرف چند روزہ تھی۔ اب مجھے اپنی مصیبت کے ساتھ اس کی مصیبت پر بھی غم کھانا ہے۔

روپیہ، کپڑے، ماکولات، کوئی چیز بھی نہ بھیجنا۔ کیونکہ مجھے کچھ بھی پہنچ نہیں سکتا۔ اور اگر پہنچے بھی، تو بیکار ہے۔ روپیہ اس لئے بیکار ہے۔ کہ ہم کوئی چیز خرید نہیں سکتے۔ کپڑے اس لئے بیکار ہیں۔ کہ کپڑے دھلوانے کی ہمیں اجازت نہیں۔ خود اپنے ہاتھوں سے دھوکر پہننا ہیں۔ اس حالت میں پرانے اور نئے کپڑے یکساں ہیں۔ لہذا کوئی چیز بھی نہ بھیجو۔

بیمار سے لئے جو کھانا مقرر ہوا ہے۔ وہ صرف شوربا ہے۔ ایک ظرف میں ۸ آدمیوں کے لئے شوربا آتا ہے۔ اور ہرگز کافی نہیں ہوتا۔ شام کو مولی کے پتوں کا شوربا ہوتا ہے۔ ہم لوگ یہ کھانا بالکل کھا نہیں سکتے۔ بھوکوں مر رہے ہیں۔ بہت ناتواں ہو گئے ہیں۔ ہر لحظہ موت کا انتظار ہے۔ دیکھا چاہیے۔ ہم میں کون پہلے قبر میں جاتا ہے۔"

بچوں کو پیار۔ سب کو سلام۔

۸ رجمادی الاخر ۱۳۳۵ھ

(۹)

نعیمہ خانم اور فرزند عزیز علی حیدر کے نام

یہ غالباً میرا آخری خط ہے۔ کیونکہ ہمارا کھانا بند ہو چکا ہے۔ اور سخت تکلیفیں دی جا رہی ہیں۔ جیسا کہ پچھلے خط میں لکھ چکا ہوں۔

اب وہ ہمیں زہر دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بلکہ کئی مرتبہ شے بھی چکے ہیں لیکن میرے خادم عارف (جواب میرے ہی ساتھ قید ہے) کی وفاداری اور بے داری کی وجہ سے اب تک انہیں کامیابی نہ ہوسکی۔ ایک دن عارف نے ایک افسر کے ذریعہ دودھ خریدا سا قسر نے اُس میں زہر ملا دیا تھا۔ عارف پہچان لیا۔ اور دودھ پھینک دیا۔ ۴ دن بعد عارف نے گوشت خرید کر میرے لئے پکایا۔ مگر اُس کے ہلتے ہی اُس میں زہر ڈال دیا گیا۔ چند دن بعد ہمارے پانی کی صراحی میں زہر ملا دیا گیا۔ ہمارے محافظ بکر آفندی جرکسی نے اعتراف کر لیا ہے۔ کہ قصرِ شاہی سے روز تاکیدی حکم آرہے ہیں کہ ہمیں فوراً مار ڈالا جائے۔ چنانچہ عثمان پاشا والی مکہ معظمہ سے خاص اسی غرض سے یہاں بھیجدیا ہے۔ اور وہ قتل کی طیاریوں میں لگا ہوا ہے۔ ظاہر ہے۔ ہم اِن تمام قوتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ موت یقینی ہے۔ شاید اس خط کے پہنچنے سے پہلے ہی تمہیں میری موت کی خبر پہنچے لیکن تم رنجیدہ نہ ہونا۔ کیونکہ مجھے اُمید ہے۔ یہ موت، میرے تمام گناہوں کا کفارہ ہو گی۔ میں اپنے وطن اور اُمت کی راہ میں مر رہا ہوں۔ میری وصیت یہ ہے کہ حکومت کوشش کرے گی تمہیں آستانہ لے جائے۔ اور تمہارا وظیفہ مقرر کرے۔ مگر تم اسے منظور نہ کرنا۔ اپنے گھر ہی میں رہنا۔ میری بہن صدیقہ خانم کو اپنے ساتھ رکھنا۔ اور ترکہ میں سے انہیں بھی حصّہ دینا۔ میں نے تمہیں خدا کے سپرد کیا۔

۱۰ رجب ۱۳۰۱ھ

آخری خط

شہادت سے ایک دن پہلے لکھا گیا

علی وصفی آفندی کے نام

میں تمہیں پہلے بھی خط لکھ چکا ہوں - اپنی سوانحعمری کا ایک جزو ختم کر کے تمہیں بھیج چکا ہوں - پڑھنے کے بعد سمرنا بھیجدینا - اب زندگی کی کوئی اُمید باقی نہیں رہی - کیونکہ یہ لوگ زہر دینے میں ناکامیاب رہے - اب کوئی دوسری تدبیر کریں گے - میں ہر لمحہ خداوند تعالیٰ سے مغفرت کی دعائیں کرتا رہتا ہوں - اگر میں مر جاؤں - تو فقراء پر دس پونڈ خیرات کر دینا - جو تمہارے پاس امانت ہیں - اگر اس سے زیادہ خرچ کرنا - تو سمرنا سے روپیہ طلب کر لینا - فوراً آجائے گا - میرے مرشد شیخ سلیمان کی دست بوسی کرو - اور میرے حق میں دعا کی درخواست کرو - درویش صلاح الدین پر بھروسہ نہ کرنا - کیونکہ اُس کی طبیعت کا حال معلوم ہے بلا ضرورت مجھے نہ لکھنا - آیندہ شاید میں بھی کچھ نہیں لکھ سکوں گا - کیونکہ حالت بہت خطرناک ہو گئی ہے - والسلام -

---

مدحت پاشا کا قتل

مدحت پاشا کے رفیق محبس شیخ الاسلام خیر الدآفندی نے (جو خود

بھی قید خانہ طائف میں فوت ہوئے) مدحت پاشا اور داماد محمود پاشا کے ہولناک قتل کا حال اس طرح لکھا ہے:

"مدحت پاشا اور اُن کے رفقاء طائف کے قلعہ میں تین سال قید رہے تیسرے سال کے آخر میں مدحت پاشا کے ایک پھوڑا نکل آیا تھا۔ فوجی ڈاکٹر کی رائے تھی۔ کہ چاک کر دیا جائے، مگر بڑھاپے اور کمزوری کی وجہ سے وہ عمل جراحی پر رضامند نہ ہوئے۔ پھر یہ سبب بھی تھا۔ کہ موصوف کو ڈاکٹر کی مہارت پر یقین نہیں تھا۔ داماد محمود پاشا نے والی حجاز کو مدحت پاشا کی لاعلمی میں تحریر کیا۔ کہ کسی ماہر طبیعت کا انتظام کیا جائے۔ اُس کے مصارف وہ خود ادا کریں گے۔ مگر والی نے اُن کی درخواست کا کوئی جواب نہیں دیا۔

مدحت پاشا نے اپنا علاج خود کیا۔ اور زخم اچھا ہو گیا۔ سرکاری طبیب روز معائنہ کرتا تھا۔ اور والی کو اطلاع دیتا تھا۔ والی تار برقی کے ذریعہ روزانہ سلطان کو خبر بھیجتا تھا۔ کیونکہ سلطان کو مدحت پاشا کی موت کی جلدی تھی۔

ایک دن صوبہ دار ابراہیم آغا کے ساتھ ڈاکٹر مدحت پاشا کے کمرے میں گیا۔ اور بغیر کسی مناسبت کے کہنے لگا "اب یورپ میں سیاسی مدبروں کو علانیہ قتل نہیں کیا جاتا۔ جلادوں کے بجائے یہ کام ڈاکٹر انجام دیتے ہیں۔ مجرم کی ناک پر کلوروفارم رکھ دیتے ہیں۔ جب وہ سو جاتا ہے۔ تو گلا گھونٹ دیا جاتا ہے۔" لوگوں نے طبیب کے منہ سے یہ بات سُنی، مگر

کوئی اس کا مطلب سمجھ نہ سکا۔

تیسری پلٹن کا کماندار بکر آفندی چرکسی، قلعہ کے سیاسی قیدیوں کا محافظ تھا۔ چند مہینے سے وہ موجود نہ تھا۔ بلکہ مکہ معظمہ میں مقیم تھا۔ مگر اچانک واپس آگیا۔ اور سیدھا مدحت پاشا کے کمرے میں چلا گیا۔ اُس کے ساتھ ڈاکٹر اور ابراہیم آغا بھی تھے۔ لوگوں نے اُس سے اِس اچانک واپسی کی وجہ دریافت کی۔ تو کہنے لگا:۔ طائف کی فوج مرتب کرنے اور طربہ کے باشندوں سے سرکاری محصول وصول کرنے آیا ہوں۔ کیونکہ کئی سال سے انہوں نے ایک پیسہ بھی ادا نہیں کیا"

بکر آفندی کی واپسی کے چھٹے دِن قیدی پاشاؤں کے خادم حضرت عبداللہ بن عباس کی مسجد میں نماز جمعہ ادا کرنے گئے۔ حسب عادت اُن کے ساتھ پہرا تھا۔ مدحت پاشا کا خادم عارف آفندی نماز کو جا نہیں سکا۔ کیونکہ اس کے آقا کی طبیعت ناساز تھی۔

نماز کے بعد بکر آفندی کماندار نے تمام خادموں کو روک لیا۔ قلعہ میں واپس جانے نہیں دیا۔ نیز ایک آدمی بھیجکر عارف آغا کو بھی طلب کیا مگر اُس نے اپنے آقا کے پاس سے ہٹنا منظور نہیں کیا۔ کماندار نے پھر آدمی بھیجا۔ کہ عارف کو فوراً لے آؤ۔ اس مرتبہ مدحت پاشا نے قاصد سے کہا۔ کہ کماندار سے کہو۔ وہ خود قلعہ میں آئے۔ اور عارف سے جو کچھ کہنا ہے۔ کہہ جائے۔

کماندار فوراً آیا۔ اور خیراللہ آفندی کے کمرہ میں گیا۔ اُس نے

خیراللہ آفندی سے کہا:

"دارالخلافہ سے حکم آیا ہے۔ کہ تمام نوکر چاکر سیاسی قیدیوں سے علیحدہ کر دئیے جائیں۔ اب انہیں حکومت کی طرف سے کوئی رقم بھی نہیں دی جائے گی۔ عام قیدیوں کا کھانا کھلایا جائے۔ بازار سے بھی خریدنے کی ممانعت ہے۔ قلم، دوات، کاغذ بھی رکھنے کی اجازت نہیں خیراللہ آفندی کی بیوی بھی (جو طائف میں مقیم تھیں) نکال دی جائیں گی"

اس خبر نے تمام قیدیوں کو سخت پریشان کیا۔ محمود پاشا غصہ ور آدمی تھے۔ انہوں نے کماندار کو بہت سخت سست کہا۔ مگر بے فائدہ تھا سلطانی حکم پر عمل کیا گیا۔ تمام خادم، قلعہ کے باہر ایک گھر میں قید کر دئیے گئے۔ کماندار نے چلتے وقت کہا۔ وہ طائف سے باہر جا رہا ہے مگر گیا نہیں۔ رات بھر قلعہ ہی میں رہا۔

مدحت پاشا دو مرتبہ وزیرِ اعظم بن چکے تھے۔ اور قوم کی عظیم الشان خدمات انجام دی تھیں۔ مگر ظالموں نے نہ اُن کی خدمات کا کوئی لحاظ کیا، نہ بڑھاپے ہی پر ترس کھایا۔ انہیں بسترِ مرض پر اکیلا چھوڑ دیا۔ اُن کا خادم زبردستی لے گئے۔ اس وفادار خادم کے عوض ایک جنگلی سپاہی اُن کی تیمارداری کے لئے مقرر کر دیا۔ لیکن مدحت پاشا کے رفقاء مصیبت نے اُن کی خدمتگاروں کی طرح خدمت کی۔ رات کو بھی انہیں تنہا نہیں چھوڑتے تھے۔ علی بک اُن کے ساتھ سوتے تھے۔

مدحت پاشا اپنی شجاعت اور ثابت قدمی میں مشہور ہیں۔ اِن حالات

اُن کے حوصلے کمزور نہیں کئے۔ وہ اب بھی خوش تھے۔ پابندی سے نماز پڑھتے تھے۔ وظائف کا ورد رکھتے تھے۔ تلاوت میں مشغول رہتے تھے۔ تفسیر بیضاوی اور کتاب الشفاء، اُن کے مطالعہ میں رہتی تھی۔

وہ کہا کرتے تھے، جو کچھ یہ لوگ کر سکتے ہیں، کر گذریں۔ ہم المجد اللہ مقدس سرزمین میں موجود ہیں۔ تمام گندگیوں سے دُور ہو چکے ہیں۔ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ زیادہ سے زیادہ قتل کر سکتے ہیں، اور قتل ہمارے لئے دنیا و آخرت میں عزت و سعادت کا ذریعہ ہے!" وہ حیرت انگیز طور پر اللہ تعالیٰ کی ذات پر متوکل نظر آتے تھے۔

ایک دن کمانڈر بکر آفندی نے کہا۔ وہ ۸ ربا۔ حج کو مکہ معظمہ جائے گا۔ تلکہ خیراللہ آفندی کی بیوی اور قیدیوں کے نوکروں کو پہنچا آئے۔ وہ مدحت پاشا کے پاس بھی گیا۔ وجہ یہ بیان کی۔ کہ رخصت ہونے آیا ہے۔ مگر مقصود یہ تھا کہ اُن کی زبان سے کچھ سُنے اور چغلی کھا کر ظالموں میں مقبولیت حاصل کرے۔ مدحت پاشا نے کہا۔ میری تقریر سنو۔ حرف بحرف والی حجاز سے کہہ دینا:-

کہنا عبدالحمید نے تمہیں بڑا منصب بخشا ہے۔ مدحت پاشا کی خدمات آفتاب کی طرح روشن ہیں۔ آج اس کی جو حالت ہے۔ دیکھ رہے ہو۔ یہ سلطان، اسی طرح اپنے خیرخواہوں کی خدمات پر انعام دیا کرتا ہے۔ مدحت پاشا کو معلوم ہے۔ کہ سلطان اُس کے قتل پر تلا ہوا ہے۔ تمہیں اس کام پر مقرر کیا ہے۔ اس وقت تمہاری جتنی خاطر مدارات ہے، صرف اسی مطلب

سے ہے۔ اس کے بعد تمہارا جو حال ہوگا، وہ دوسروں کی حالت سے معلوم کر سکتے ہو۔ سروری آفندی نے ہمیں سزا دی تھی۔ اس پر سلطان نے خوش ہو کر اُسے "قاضی عسکر" کا عہدہ دیا۔ مگر اب سروری آفندی کی حالت کیا ہے؟ اس وقت وہ مگینشا میں جلا وطنی کی زندگی بسر کر رہا ہے بہجت پاشا ہمارے گھرانے میں سلطان کا دست و بازو تھا۔ مگر آج اُس کی حالت کیا ہے؟ اس وقت وہ خود اپنے گھر میں قید ہے۔ اور ذلت کی زندگی بسر کر رہا ہے! ان معاملات پر غور کرو۔ کیونکہ اس سلطان کی طبیعت ہی ایسی ہے تم مسلمان ہو۔ قرآن پڑھو۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ومن یقتل مؤمناً متعمداً فجزاؤہ جہنم خالداً فیہا وغضب اللہ ولعنہ واعدلہٗ عذاباً عظیماً! (جو کوئی جان بوجھ کر کسی مؤمن کو قتل کرے، اس کی سزا جہنم ہے۔ جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اس پر خدا کا غضب ہوگا۔ خدا کی لعنت ہوگی۔ اور اس کے لئے بہت بڑا عذاب طیار ہے!)

اس کے بعد مدحت پاشا نے اس آیت کی تفسیر بیان کی اور کہا۔

دیکھو حضرت حسن بن علی علیہ السلام بھی بعض بادشاہوں کے اشارے سے قتل کئے گئے تھے۔ قیامت تک دنیا ان کے قاتلوں پر لعنت کرتی رہے گی۔ خدا انہیں دوزخ میں ڈالے گا۔ تم والی سے میری تقریر حرف بحرف کہہ دینا۔"

اس پر بکر آفندی نے کہا:۔

"جناب عالی! میں بہت سی لڑائیوں میں شریک ہوا ہوں۔ مگر میدانِ جنگ

کے باہر آج تک ایک مرغی بھی اپنے ہاتھ سے نہیں ماری۔ مگر ہرگز کوئی جرم نہیں کر سکوں گا!"

سات دن بعد بکر آفندی واپس آیا۔ اُس کے ساتھ قیدیوں کے نوکر بھی تھے۔ اُس نے مدحت پاشا سے کہا۔ سلطان کا حکم آیا ہے۔ کہ نوکر قیدیوں کے پاس واپس کر دئے جائیں۔ انہیں ہر طرح آرام دیا جائے۔ والی حجاز نے سلام کے بعد معذرت کی ہے۔ کہ میرا قصور نہیں۔ میں نوکر ہوں۔ آقا کے حکم کی اطاعت کرتا ہوں۔

اِس درمیان میں مدحت پاشا کی صحت اچھی ہوگئی۔ تقریباً شفا حاصل ہوگئی تھی۔

ایک دن مدحت نے ایک سپاہی سے دودھ منگایا۔ ایک افسر نوری آفندی تلوار لے کر اُس کے ساتھ ہوگیا۔ اور بڑی مستعدی سے دودھ لے آیا۔ لوگوں کو اس نئی بات پر بہت تعجب ہوا۔ یہ شخص کبھی قیدیوں سے اچھا سلوک نہیں کرتا تھا۔ آج کیوں اس قدر مہربان ہوگیا۔؟ سید بک، مدحت پاشا کے کھانے کی روز جانچ کر لیا کرتے تھے۔ انہوں نے پتیلی کھولی۔ تو دودھ کا رنگ اچھا نہ تھا۔ ایک چمچ لے کر انہوں نے اپنی زبان پر رکھا، تمام منہ کڑوا ہوگیا۔ دوسرے قیدیوں کو چکھایا، سب نے یہی محسوس کیا۔ جنہوں نے ایک دو قطرے بھی نگل لئے تھے۔ وہ بیہوش ہوگئے۔ اور کئی ہفتے بیمار پڑے رہے۔

مدحت پاشا کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی۔ تو انہوں نے محمد آغا کو بلا کر انتہائی رنج کر کہا:۔

دُودھ والے نے ہمیں وہی دودھ بھیجا تھا جس میں سے کماندار کو دیا کرتا ہے۔ لیکن جس نے بھی دُودھ کا ایک قطرہ زبان پر رکھا، اُس کا حلق جل گیا۔ معلوم ہوتا ہے۔ زہر، تانبے کے کساؤ سے پیدا ہو گیا ہے۔ تم ابھی جاکر کماندار کو خبر کر دو۔ ایسا نہ ہو۔ اُنہیں کوئی نقصان پہنچ جائے"

محمد آغا نے واپس آکر کہا۔ کماندار ابھی دودھ والے کے برتنوں کا معائنہ کریں گے۔ اُسے ماریں گے۔ قید کر دیں گے۔ پوری تحقیقات کریں گے۔ قیدیوں نے یہ سُنا تو مسکرانے لگے۔ کیونکہ سُن چکے تھے۔ کہ کماندار اپنے ساتھیوں سے پوچھتا تھا "اِن لوگوں نے دُودھ تو کھالیا ہوگا؟ کیا مر گئے؟ کیا زہر کا اثر فوراً ظاہر ہوتا ہے؟"

مدحت پاشا کے بعض رفقاء نے مسموم دودھ کماندار کے پاس بھیجدیا۔ کہ اس کی کیمیاوی تحلیل کی جائے۔ لیکن اُس نے ہنس کر دودھ واپس کر دیا اور کہا۔ یہاں تحلیل کرنے کے آلات موجود نہیں!"

اس واقعہ کے بعد باورچی خانہ اچھی طرح بند کر دیا جاتا تھا۔ کھانے پینے کے برتنوں پر علامتیں لگادی جاتی تھیں۔ لیکن دو ہفتہ کے بعد ایک دن عارف آغا نے جونہی دروازہ کھولا۔ برتنوں پر سے علامتیں ہٹی ہوئی تھیں۔ باسی کھانے کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ تحقیقات سے معلوم ہو گیا۔ کہ زہر ملا دیا گیا ہے بعد میں شمس آغا اور نوری آفندی نے اقرار کیا۔ کہ اُنہوں نے زہر ملایا تھا!"

اسی اثنا میں محمود پاشا، دست و قے میں مُبتلا ہو گئے۔ پتہ چلا۔ قہوہ میں کوئی زہریلا مادہ ملا ہوا ہے۔ انہوں نے قہوہ پینا چھوڑ دیا۔ اور اچھے ہو گئے۔

ایک دن پانی کا رنگ اور مزہ بدلا ہوا تھا۔ اس میں زہر ملا دیا گیا تھا۔ فوراً صراحی توڑ ڈالی گئی۔

بعد میں معلوم ہوا۔ کہ زہر، مصر سے مہیا کیا جاتا تھا۔ لانے والا ایک شخص اسمٰعیل آغا تھا۔ والی حجاز کو اس پر بہت اعتماد تھا۔ اور اسی کے ذریعہ دشمنوں کو قتل کرایا تھا۔ یہ ایک مدت سے یہاں آیا ہوا تھا۔ مگر تنہا اس خطرناک جرم کا مرتکب نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ۱۲؍ مارچ سنہ ۱۳۰۱ھ کو، سالار محمد لطفی دو رجمنٹ فوج اور توپ خانہ لے کر مکہ معظمہ سے آیا۔ اور قلعہ کے محافظوں میں اپنے ۴۰ سپاہی داخل کر دیئے۔

محمد لطفی نے آتے ہی مدحت پاشا کے خادم عارف آغا کو طلب کر کے کہا "میں زہر لایا ہوں۔ اگر تم مدحت پاشا کو کھلا دو۔ تو تمہیں ایک ہزار پونڈ انعام دیا جائے گا۔ ایک دوسرا شخص محمود پاشا کو مارنے کے لئے تیار ہو گیا ہے۔ اُسے ۵ ہزار پونڈ انعام دیا جائے گا"

عارف آغا وفادار نوکر تھا۔ اُس نے بظاہر زہر لے لیا۔ اور وعدہ کیا۔ کہ اپنے آقا کو قتل کر ڈالے گا۔ مگر قلعہ میں واپس آکر مدحت پاشا اور محمود پاشا کو پورا قصہ سُنا دیا۔ اُنہوں نے باقی رفقاء کو مطلع کیا۔ سب نہایت پریشانی میں پڑ گئے۔

محمد لطفی، خاص قتل کے ارادے سے آیا تھا۔ تمام قیدی اس حقیقت سے واقف ہو چکے تھے۔ اپنی آمد کے ایک ہفتہ بعد اُس نے ارتکاب جرم کی پھر کوشش کی۔ پورے قلعے میں فوج لاکر بھر دی۔ اور محاصرہ کر لیا۔ مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ کیونکہ مدحت پاشا کے خادم عارف آغا نے بڑی ہی وفاداری سے کام لیا تھا

اور راز فاش کر دیا تھا۔

واقعہ یہ ہوا کہ صوبہ دار ابراہیم نے عارف آغا کو کئی دوسرے افسروں کی موجودگی میں بُلا کر کہا۔

ہم آج رات مدحت پاشا کا خاتمہ کر دینا چاہتے ہیں۔ آپ سے پہلے تم زہر لے گئے۔ اور پکا وعدہ کیا، مگر اب تک کچھ بھی نہیں کیا۔ لہٰذا اب ایسا کرو کہ تم مدحت کے ساتھ سوتے ہو۔ رات کو کمرے کا دروازہ کھلا رہنے دینا۔ دیکھو اگر دروازہ بند کیے سو گئے۔ تو ہم سے بُرا کوئی نہ ہوگا!"

یہاں قلعہ میں سیاسی قیدی نمازِ عشاء کے بعد اپنے اپنے کمروں میں جانے کے لئے رخصت ہو رہے تھے۔ کہ عارف آغا نے آکر کہا۔

آپ لوگ جدا نہ ہوں، کیونکہ آج رات میرے آقا کو قتل کرنا چاہتے ہیں!"

تمام رفقاء گھبرا گئے۔ اور انہوں نے طے کر لیا۔ کہ مدحت پاشا کو تنہا نہیں چھوڑیں گے۔ ایک افسر نے عارف آغا کی گفتگو سن لی تھی۔ اس نے محمد لطفی کو خبر پہنچائی۔ محمد لطفی نے فوراً عارف آغا کی گرفتاری اور قیدیوں کے منتشر کرنے کا حکم دے دیا۔ ممش آغا ایک افسر نے آکر کہا" میرالائی محمد لطفی سلام کے بعد کہتے ہیں۔ کہ آپ لوگوں کا یکجا رہنا ممنوع ہے۔ فوراً اپنے اپنے کمروں میں چلے جائیے"

مدحت پاشا اور محمود پاشا نے جواب دیا" ہم ہرگز یہاں سے نہیں جائیں گے۔ تم تلوار کے زور سے ہمیں نکال دو!"

پھر فوراً بکر آفندی کمانڈر نے آکر کہا" عارف، ایک شریر آدمی ہے

ہے۔ وہ ایک ایسا جھوٹ اڑایا ہے۔ جسے پورے سمندر کا پانی بھی دھو نہیں سکتا"

مدحت پاشا نے پوچھا "ہمارے گرد یہ تمام طیاریاں کیسی ہیں؟"

بکر آفندی نے جواب دیا "ہمیں اب تک کوئی خاص حکم نہیں ملا ہے لیکن ہر حکم کی اطاعت ضرور کریں گے"

پھر اس نے قسم کھائی کہ اب تک جتنی خبریں مشہور ہوئی ہیں، بالکل جھوٹ ہیں، اور قلعہ سے باہر چلا گیا۔

جرم کی رات

۱۲ رجب ۱۳۰۱ھ کو رات کے پچھلے پہر میں مدحت پاشا اور داماد محمود پاشا قتل کر ڈالے گئے۔ تفصیل حسب ذیل ہے:-

اس رات میرالائی محمد لطفی اور بکر آفندی کماندار قلعہ کے پھاٹک میں رہے۔ قلعہ کے اندر بہت سی فوج جمع کر دی گئی۔ سپاہیوں کو کافی مقدار میں کارتوس تقسیم کر دیئے گئے۔ آدھی رات کے بعد محمود پاشا کے خادم حاجی شکری کو جگا کر پکڑ لے گئے۔ پھر ہر قیدی کے کمرے کے سامنے دو دو مسلح سپاہی کھڑے کر دیئے گئے۔ مدحت پاشا کا خادم عارف آغا پہلے ہی سے قید کر دیا گیا تھا۔ مگر موصوف تنہا نہ تھے۔ ناشق پاشا کے لڑکے علی بک ان کے ساتھ سو رہے تھے۔

اچانک مدحت پاشا کے کمرے کا دروازہ توڑ ڈالا گیا۔ علی بک کو

اٹھالے گئے۔ اور مدحت پاشا کو قتل کرنا چاہا۔ انہوں نے کوئی مقابلہ نہیں کیا۔ صرف خدا کے خوف سے ڈرایا۔ اور نصیحت کی۔ انہوں نے کہا۔ "دیکھو، سپاہی کا کام، وطن کی حفاظت ہے۔ نہ کہ ارتکاب جرم!"

اسی طرح قاتلوں نے محمود پاشا کا دروازہ بھی توڑا۔ وہ جاگ پڑے اور تکیہ اٹھا کر دیر تک مقابلہ کرتے رہے۔ آخر تھک گئے۔ محمد آغا، ایک افسر نے ان کے گلے میں رسی کا پھندا ڈال دیا۔ وہ زور سے چلائے "امان اللہ!" اس آواز پر سب لوگ جاگ پڑے۔

خیر اللہ آفندی پاس کے کمرے میں تھے۔ وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ سپاہیوں نے کہا "ڈریئے نہیں۔ آپ کے لئے کوئی اندیشہ نہیں ہے" مگر وہ اس قدر مرعوب ہوگئے تھے۔ کہ بیہوش ہو کر گر پڑے۔ اور رات بھر اسی حالت میں رہے۔

محمود پاشا کو قتل سے پہلے بہت تکلیف دی گئی۔ پھر گلا گھونٹ ڈالا گیا مگر یہ ناکافی سمجھا گیا۔ اور لاٹھیوں سے ان کا ہاتھ توڑ ڈالا گیا!"

قتل کے بعد دونوں شہیدوں کو غسل خانے اٹھا لے گئے۔ رات ہی کو علی بک بے وسہ لی کی دکان توڑ کر کفن کے لئے کپڑا نکالا گیا۔ اور فوج کے امام یونس آفندی کو شہیدوں کے نہلانے کا حکم دیا گیا۔ مگر انہوں نے انکار کیا۔ اس پر دونوں کو بغیر غسل اور کفن کے دفن کر دیا گیا۔ دونوں قبروں پر دو پتھر لگا دیئے گئے۔ ایک پر لکھا تھا "مدحت پاشا ۲۶ / مارچ کو فوت ہوئے۔" دوسرے پر تھا "محمود پاشا ۲ / مئی کو فوت ہوئے۔"

حالانکہ یہ بالکل جھوٹ تھا۔کیونکہ دونوں کو ایک ہی دن قتل کیا گیا تھا۔

مدحت پاشا اپنے قتل کے بہت دن سے منتظر تھے۔ واقعہ سے دو تین دن پہلے ایک مرتبہ نماز کے بعد سر جھکائے دیر تک بیٹھے رہے ساتھیوں نے فکر کی وجہ دریافت کی تو کہنے لگے:۔

"میں موت کے بارے میں غور کر رہا ہوں۔ جس کی تکلیف ۵ منٹ سے بھی کم میں ختم ہو جاتی ہے۔ سوچتا ہوں۔ کون سی موت سب سے کم تکلیف دہ ہوتی ہے: ۔ گلا گھونٹنے کی موت یا گولی کی موت، یا بیماری کی موت؟ اگر مجھے اختیار ہوتا۔ تو میں موت کو زندگی پہ ترجیح دیتا، مگر یہ معاملہ انسان کے اپنے بس کا نہیں ہے۔ دیکھو میں بیمار ہوا۔ موت سے قریب ہو کر پھر دور ہو گیا۔ ہماری وجہ سے کئی معصوم یہاں قید ہیں۔ شاید ہماری موت اُن کی رہائی کا سبب ہو گی"

وفات سے پہلے مدحت پاشا نے خیر اللہ آفندی کو ۴۰ پونڈ دیئے اور کہا "یہ میرے کفن دفن کے لئے ہیں" مگر خیر اللہ آفندی کو اس خدمت کا موقع نہیں ملا۔ اس لئے انہوں نے یہ رقم حکومت کے حوالے کر دی

مدحت پاشا اور محمود پاشا، گلا گھونٹ کر قتل کئے گئے۔ مگر حکومت نے یہی مشہور کیا۔کہ وہ بیمار ہوئے تھے۔ اور اپنی قضا سے مر گئے۔ لیکن دنیا نے یہ جھوٹ تسلیم نہیں کیا۔ اور بہت جلد حقیقت مشہور ہو گئی۔

سلطان عبدالحمید، ان دونوں شہیدانِ وطن سے اس قدر خائف تھا کہ

بہت دِن تک اُن کی موت کا اُسے یقین نہیں ہوا۔ چنانچہ دو مرتبہ اُس نے اپنے خاص آدمی حقیقتِ حال معلوم کرنے کے لئے طائف بھیجے، اور انہوں نے پوری تحقیقات کی۔ مگر سلطان کو برابر یہی شک رہا کہ دونوں کہیں بھاگ گئے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔ کہ آخر میں سلطان نے حکم دیا۔ کہ مدحت کا سر کاٹ کے اُس کے پاس بھیج دیا جائے۔ چنانچہ قبر کھودی گئی۔ سر کاٹا گیا، اور ایک صندوق میں بند کر کے روانہ کر دیا گیا۔ مگر چونکہ بیچ میں نہر سویز پڑتی تھی۔ اور وہاں کا جنگی خانہ بہت سختی سے تلاشی لیتا ہے، اس لئے صندوق پر یہ عبارت لکھ دی گئی "خاص جلالۃ السلطان کے لئے ہاتھی دانت کی مصنوعات!"

مدحت پاشا اور محمود پاشا کی قبریں کچھ عرصہ موجود رہیں۔ مگر احمد راتب پاشا نے اپنی حکومت کے زمانے میں اُن پر سے پتھر اکھڑوا ڈالے۔ اور قبریں زمین سے برابر کر دیں۔

یہ عجیب بات ہے۔ کہ اس واقعۂ قتل کے ایک ہفتہ بعد والیٔ حجاز، مرضِ فالج میں مبتلا ہو گیا تھا۔ یہ گویا خدا کا دُنیا ہی میں اُس سے انتقام تھا۔"

کینن ویبسٹر

تھوڑا عرصہ گزرا ہے، لنڈن سے ریوٹرایجنسی نے یہ خبر تمام دُنیا میں مشہور کر دی تھی۔ کہ برمنگھم کے لارڈ بشپ نے ویسٹ منسٹر میں تقریر کرتے ہوئے ایسے خیالات کا اظہار کیا ہے، جس نے یورپ کے تمام کلیسائی حلقوں میں ہلچل ڈالدی ہے۔ اُس نے صاف صاف لفظوں میں اعتراف کر لیا ہے۔ کہ پیدائشِ کائنات کا قدیم مسیحی اعتقاد (یعنی تورات کی کتاب پیدائش کا بیان) قابلِ ترمیم ہے، اور اب وقت آگیا ہے۔ کہ ہم علمی تحقیقات کی مخالفت کرنے یا غلط مذہبی تاویلوں کے ذریعہ تطبیق دینے کی ناکام کوششوں سے باز آ جائیں یعنی تسلیم کرلیں۔ کہ تورات کی کتابِ پیدائش کا بیان ایک کہانی سے زیادہ نہیں ہے۔!۔

اِس کے بعد ایک دوسرے واقعہ کی خبر مشہور ہوئی۔ یعنی بشپ جب سینٹ پال چرچ میں وعظ کر رہا تھا۔ تو اچانک ایک،

واقعہ نے تمام مجلس میں اضطراب پھیلا دیا۔ ایک طرف سے تیز صدا اُٹھی۔ "یہ بدعت و زندقہ کا معلم ہے" لوگوں نے جب اُس طرف نظر اُٹھائی، تو معلوم ہوا، پادری کینن ویبسٹر" غیظ و غضب کی شدت سے بے قابو ہو کر کھڑا ہو گیا ہے، اور واعظ کے کفر و زندقہ کا اعلان کر رہا ہے۔ اس پر غضب طریقہ سے مجلس کو اپنی طرف متوجہ کر کے اُس نے بشپ پر لعن و طعن کی بوچھاڑ شروع کر دی اور پھر یہ کہہ کر کہ "ایسے زندیق کا واعظ سننا جائز نہیں"، اپنی جماعت کے ساتھ گرجے سے رخصت ہو گیا!"

اب انگلستان کے اخبارات و رسائل میں اس معاملہ کی تمام تفصیلات آگئی ہیں۔ دراصل یہ معاملہ بھی اُسی سلسلۂ بحث کی ایک کڑی ہے جو جو سر آرتھر کیتھ کی تقریر سے تمام یورپ اور امریکہ میں چھڑ گیا ہے۔ بشپ آف برمنگھم کا نام ڈاکٹر بارنس ہے۔ اس نے اسی تقریر کا حوالہ دے کر اپنے خیالات ظاہر کئے تھے۔ معاملہ کا اہم اور دلچسپ پہلو یہ ہے۔ کہ یہ اعتراف برطانی کلیسا کے ایک بہت بڑے ذمہ دار شخص کی زبان سے ہوا ہے۔ اُس نے بڑی دلیری کے ساتھ وہ خیال علانیہ ظاہر کر دیا، جو آج ہزاروں لاکھوں عیسائیوں کے دلوں پر ثبت ہے!

بشپ نے تقریر کرتے ہوئے کہا:-

اس عہد کے افسانوں سے میں کیا کہوں؟ کیا یہ کہوں کہ قدیم عقیدہ ہی پر اُستوار رہو؟ ہرگز نہیں۔ میں اُن سے جو کچھ کہہ سکتا ہوں، وہ اِس کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کہ حق کی تلاش کرو۔ خوش ہو، کیونکہ تم ایک ایسی صدی کی مخلوق ہو۔ جو اپنی علمی ترقیوں کی وجہ سے تاریخ کی سب سے زیادہ عظیم الشان صدی ہے۔ میں اُن سے کہتا ہوں، جدید انکشافات کا خیر مقدم بجا لاؤ۔ علمأ عصر کی تعظیم کرو۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھو۔ کہ اِس تمام علمی ترقی کے پیچھے ہم برابر ایک کثیف پردہ پڑا دیکھتے ہیں۔ یہ پردہ زندگی کے تمام بنیادی مسائل کو اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے۔ اور ہماری نظروں کو اُن کی حقیقت معلوم کرنے سے روک رہا ہے۔ تم پر فرض ہے۔ کہ اِن مسائل سے قریب تر ہو تمہارا قلب ایمان سے لبریز ہو جائے۔ تمہاری رہبر عقل ہو نہ کہ خوش اعتقادی۔ اگر تم ایسا کرو گے۔ تو تمہارا ایمان ان دونوں جماعتوں سے مختلف ہوگا۔ جن میں سے ایک نے مغرورانہ انکار کی اور دوسری نے جاہلانہ خوش اعتقادی کی غلطی کی ہے!"

سر آرتھر کیتھ کے خطبہ کے بارے میں ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ مذہب نشو و نما و ارتقا کے مقابلہ میں ہمارا مسلک کیا ہونا چاہئے؟ کیا ہم حقیقت کو جدل کے موٹے پردوں میں چھپا لیں؟ میں تم سے آج یہ کہنا چاہتا ہوں۔ کہ تم اِس روشن زمانے کی مخلوق ہو کر حقیقت سے تجاہل نہیں برت سکتے!"

"کیا ہمارے لئے یہ جائز ہے۔ کہ لوگوں کی عقلوں میں شک پیدا کر دیں، حالانکہ یہاں شک کا کوئی موقع ہی نہیں؟ کیا یہ مناسب ہے کہ مسیحی عقائد کی تاریخ محض اس لئے بدل دی جائے۔ کہ ڈارون کا مذہب نیا نہیں ہے، پرانا مذہب ہے؟ یا یہ مناسب ہے۔ کہ جدید حقائق تسلیم کرتے ہوئے حقیقت کا صاف صاف اعتراف کرلیں، اور تسلیم کرلیں۔ کہ مسیحی عقاید کی بعض تقلیدی آراء قابل تبدیل ہیں؟"

میرے خیال میں آخری تجویز بہتر اور مناسب ہے۔ آؤ، ہم بے خوف و خطر حقائق کا ویسا ہی خیر مقدم کریں، جیسا کہ وہ علمی حلقوں میں اپنا خیر مقدم دیکھ رہے ہیں۔ تمام اہلِ علم متفق ہیں۔ کہ انسان نے بندر کی ایک قسم سے ترقی کی ہے۔ ممکن ہے کہ انسان کی یہ ترقی دس لاکھ برس پہلے شروع ہوئی ہو۔ تمام حیوانی اصلوں نے مختلف سمتوں میں ترقی کی ہے، لیکن انسان کی حقیقی ترقی اس کے دماغ اور فکری مرکزوں میں واقع ہوئی ہے۔ اسلئے وہ اپنے ہم جنس حیوانوں پر بازی لے گیا۔ بندر کی دوسری قسموں نے اور قسم کی ترقی کی۔ چنانچہ بتدریج شمپانزی، گوریلا اور اورانگ اوتان کی قسموں نے ظہور کیا۔ یہ تمام بندر انسان کے قریبی عم زاد ہیں۔ علماء اس ترقی کی جزئیات میں کتنا ہی مختلف ہوں، لیکن کوئی دو مستند عالم بھی اس معاملہ میں اختلاف نہیں رکھتے۔ کہ انسان نے بندر ہی سے ترقی

کی ہے۔ اور یہ، کہ یہ ترقی ایک مسلم وثابت حقیقت ہے۔ ڈارون کا مذہب پچاس برس سے موجود ہے۔ اور پوری طرح صحیح ثابت ہو چکا ہے۔۔۔"

"علم الحیات کے مباحث سے ثابت ہو چکا ہے۔ کہ شر اور برائی کا میلان انسان کی طبیعت میں فطری ہے، اور یہ اُس نے اپنے اسلاف سے ورثہ میں پایا ہے۔ یہ بالکل یقینی ہے۔ کہ انسان، ایک حیوان ہی ہے۔ اور اپنے اعضاء اور روح میں بتدریج ترقی کر کے خالص حیوانیت سے اس درجہ تک پہنچ گیا ہو۔ وہ کوئی دیوتا نہ تھا۔ جو طہارت و تقوی کے لباس میں ملبوس آسمان سے زمین پر اتر پڑا ہو۔ انسان کی روحی ترقی ہی نے اُسے باقی تمام حیوانات سے ممتاز کر دیا ہے"

ہمیں ہمیشہ حق کی جستجو میں لگے رہنا چاہیئے۔ جب کبھی کسی حقیقت پر سے پردہ اُٹھے، تو قدیم سے قدیم تقلیدی خیال کے بھی ترک کر دینے میں ہمارے اندر کوئی پس و پیش نہیں ہونا چاہیئے؛ اور نہ اس تبدیلی پر کسی طرح کا رنج محسوس کرنا چاہیئے"

جب کبھی کوئی حقیقت ظاہر ہوتی ہے؛ تو ایک خاص قسم کے لوگ چلا اُٹھتے ہیں: "ایمان خطرے میں پڑ گیا ہے!"

لیکن میرا تاریخی مطالعہ مجھے بتاتا ہے۔ کہ ایمان صرف اُس وقت خطرے میں ہوتا ہے؛ جب عقل قید کر دی جاتی ہے؛ اور دماغ پر مہر

لگا دی جاتی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں "ہمیں مسیحی حقائق کو اُسی طرح محفوظ رکھنا چاہیئے، جس طرح ہمارے عقائد چلے آتے ہیں۔" لیکن میں من گھڑت حقائق کے وجود سے اپنی لاعلمی کا صریح اعلان کرتا ہوں بعض لوگ کہتے ہیں "جدید خیالات کفر و الحاد ہیں" لیکن میں کہتا ہوں "آج کا کفر ممکن ہے، کل کا ایک راسخ دینی عقیدہ بن جائے۔"

"تمام وہ مسیحی جو تقلیدی بندشوں سے آزاد ہیں، جانتے ہیں، کہ مذہب نشو و ارتقا، اور حقیقی مسیحی تعلیم میں کوئی نزاع نہیں ہے۔ کیونکہ خدا اپنی قدرت تدریجی ترقی میں بھی اُسی طرح ظاہر کر سکتا ہے، جس طرح فوری تخلیق میں۔"

یہ پہلا موقعہ نہیں ہے۔ کہ اِس موضوع پر اِس بشپ نے اظہارِ خیال کیا ہے۔ اب سے دو سال پہلے بھی اِسی قسم کے خیالات ظاہر کئے تھے اُس زمانے میں امریکا کے پروفیسر سکوبس پر اس لئے مقدمہ چلایا گیا تھا، کہ اُس نے ایک سرکاری مدرسہ میں اپنے شاگردوں کے سامنے ڈارون کا مذہب پیش کر دیا تھا۔ اِس مناسبت سے رسالہ "نیچر" نے بشپ مذکور سے اِس مسئلہ کی نسبت استفتا کیا تھا۔ بشپ کا جواب حسب ذیل تھا:

یہ جاہلانہ تعصب جس نے مذہب نشو و ارتقاء کی تعلیم کو امریکہ کے سرکاری
مدارس میں ممنوع قرار دے دیا ہے، ایک سخت مذموم تعصب ہے۔ میں
آزادیٔ خیال کا حامی ہونے کی حیثیت سے نہایت ناپسند کرتا ہوں۔ کہ
ایک اینگلوسکسن جماعت قانون کے زور سے علم کی اشاعت روکے۔ میں
ایک مسیحی ہونے کی حیثیت سے ہر ایسی تحریک کا انتہائی رنج و غم سے دیکھتا
ہوں، جو مسیحی دین کو معقول بنیادوں پر استوار کرنے سے روکتی ہے"

بے شمار دلائل سے ثابت ہو چکا ہے، اور متمدن دنیا میں ہر مستند عالم
اس کا اعتراف کر رہا ہے: کہ انسان نے ایک ایسی مخلوق سے ترقی کی جو
بندر سے مشابہ تھی، انگلستان میں ہر روشن خیال مسیحی کا اعتقاد یہی ہے
یہاں کے تمام مشاہیر لاہوتی علماء بھی اس رائے کو خیال صحیح سمجھتے ہیں،
یہ اعتراف مسیحیت کو اور بھی زیادہ مستحکم کر دے گا۔ کیونکہ یہ اس روحانی
اساس کو جو ہم مسیح سے اخذ کرتے ہیں، اس درجہ معقول بنا دیتا ہے۔ کہ
کوئی بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا"

"ہم کتنا ہی انکار و مغالطہ کام میں لائیں، مگر مسیح کی تعلیمات سے جو
عہد جدید میں موجود ہیں، ہرگز ثابت نہیں کر سکتے۔ کہ عہد قدیم کی کتاب
پیدائش حرف بحرف صحیح ہے۔ لوگ یہ بھول گئے۔ کہ کتاب مقدس روحی
حقائق کا خزانہ ہے، نہ کہ تعلیم و تدریس کی کوئی علمی کتاب ہے۔ لوگ

یہ مسیحی عقیدہ بھی بالکل بھول گئے ، کہ روح القدس برابر لوگوں کی عقلیں وسیع کرتی رہے گی ۔ تاکہ وہ حق تک پہنچ سکیں ؟ یہ لوگ حق کے جاننے سے ڈرتے ہیں ، کیونکہ سمجھتے ہیں ، حق کے اعتراف سے مسیحی عقیدہ کمزور ہو جائے گا ۔ مگر یہ اُن کی غلطی ہے ۔ علم کی اس مقاومت کا نتیجہ اِس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ ہزار ہا طالب علم مسیحیت کے دائرے سے یہ یقین کرتے ہوئے نکل جائیں ۔ کہ مسیحیت کی بنیاد سراسر جہل و خرافات پر ہے ! "

دیش بندھو چترنجن داس

تاریخ کا انتظار

فرانس کے مشہور مصنف وکٹر ہیوگو Victor Hugo نے والٹیر Voltaire کی صد سالہ یادگار مناتے ہوئے کہا تھا "زندگی کتنی ہی شاندار اور عظیم ہو لیکن تاریخ اپنے فیصلہ کے لئے ہمیشہ موت کی منتظر رہتی ہے" اگر یہ سچ ہے تو ہندوستان کے مورخ کا انتظار ختم ہو چکا۔ دیش بندھو چترنجن داس کی زندگی کی عظمت اب تاریخ کے اوراق کیلئے ایک فیصل شدہ واقعہ ہے۔ وہ اپنی زندگی میں اپنے لئے جو بات نہیں بتلا سکے تھے، اپنی موت سے دنیا پر آشکارا کر گئے!

ہندوستان نے اپنی جدید تاریخ میں شاید ہی کسی قومی رہنما کی موت پر ایسا عالمگیر ماتم کیا ہوگا، جیسا دیش بندھو کی ناگہانی وفات پر ہوا۔ ۱۶ر جون کو جب انکی نعش کلکتہ کی طولانی سڑکوں پر سے گزری، تو اس عظیم الشان شہر نے اپنی پوری آبادی استقبال کے لئے صف بستہ کر دی تھی۔ ماتمی انسانوں کا ایک صحرا تھا، جو ایک کنارے سے دوسرے تک پھیلا ہوا تھا۔ غمگین دلوں سے اشکبار آنکھوں کی ان گنت تعداد اس کے علاوہ ہے جو راس کماری سے لے کر کشمیر تک، ہر جگہ ہندوستان

میں دیکھی جا سکتی تھی!۔

پہلی جولائی کی مغموم اور خاموش سہ پہر کے اضافہ نے اس ماتم کی تاثیر اور زیادہ مکمل کر دی۔ اس دن برِاعظم ہند کے گوشے گوشے میں ماتمی مجلسیں منعقد ہوئیں جن کی روداد سے اس وقت تک اخباروں کے صفحے رنگے ہوئے ہیں۔

ہندوستان جو بدقسمتی سے زندگی کے ہر گوشے میں طرح طرح کے تفرقوں میں بٹ چکا ہے، موت کے اس ماتم میں کس طرح متحد ہو گیا تھا۔ مذہب، نسل، جماعت کوئی اختلاف بھی یہ اتحاد نہ روک سکا۔ سب نے بیک وقت محسوس کیا۔ کہ ہم میں سے ایک بڑی زندگی جدا ہو گئی ہے۔ ان میں بہت سے ایسے بھی تھے۔ جو اُن کی زندگی میں اُن کی پیروی نہ کر سکے تھے۔ بہت سے ایسے بھی تھے۔ جن کے قدم ہمیشہ اُن کے خلاف اُٹھا کرتے تھے۔ تاہم جب وہ مر گئے، تو ان میں سے کوئی بھی اپنے آپ کو اُن کی رِثا سے نہ روک سکا۔ زندگی کیلئے موت کا یہی فیصلہ ہے جس کا تاریخ انتظار کیا کرتی ہے!

موت کا ماتم اور زندگی کے آثار

ہندوستان کے کروڑوں دلوں کا یہ متحدہ احساس ہندوستان کی موجودہ تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ ایسے ہی واقعات سے احساسِ قومیت کے ضعف و قوت اور اس کے نشو و نما کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس میں صرف ایک ہردلعزیز انسان کی موت کا غم ہی نہیں ہے۔ بلکہ کروڑوں دلوں کی زندگی کی جھلک بھی دکھائی دے رہی ہے۔ یہ موت کی مایوسی میں زندگی کی امید ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک کی عام زندگی میں غفلت اور افسردگی کتنی ہی نمایاں

بوگئی ہو۔ لیکن اسکی تہ میں ایک گہری اور حقیقی بیداری جگہ پکڑ چکی ہے، اور جیساکہ تاریخ کا تجربہ شہادت دیتا ہے، بیداری کی یہ اندرونی قوت جب ایک مرتبہ جگہ پکڑ لے۔ تو پھر اسے پامال نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اپنے نشوونما اور تکمیل میں ہمیشہ سے اٹل رہی ہے۔ اور ہمیشہ اٹل رہے گی!

دیش بندھو کی کامیابی کا راز

لیکن میں اس وقت اتنا دور نہیں جانا چاہتا۔ میں تو صرف اس بات پر غور کرنا چاہتا ہوں۔ کہ اس شخصیت نے بہ حیثیت ایک سیاسی رہنما کے جو کامیابی حاصل کی۔ اس کا راز کیا ہے؟ ہر شخص کو معلوم ہے۔ کہ ان کی ملکی رہنمائی کی عمر کوئی بڑی عمر نہیں ہے۔ انکی نمایاں قابلیتوں پر اگرچہ عرصہ سے نظریں پڑ رہی ہیں اور ۱۹۱۷ء میں وہ اچھی طرح پبلک پلیٹ فارم پر نمایاں ہوگئے تھے، تاہم انکی رہنمائی کا اصلی زمانہ تحریک لاتعاون (نوان کوآپریشن) سے شروع ہوتا ہے۔ یہ زیادہ سے زیادہ پانچ سال کا زمانہ ہے قلیل عرصہ کے اندر ہی انہوں نے ہندوستان کی تاریخ میں اپنی نمایاں جگہ بنالی۔ اور تمام ملک کے قلوب فتح کرلئے۔ ہمیں معلوم کرنا چاہیئے کہ اس غیر معمولی کامیابی میں انکے ان غیر معمولی اوصاف کو زیادہ دخل تھا؟

جس طرح ایک مکمل تصویر بنانے کیلئے کوئی ایک رنگ ہی کافی نہیں ہوتا۔ اسی طرح ایک بڑے آدمی کیلئے بھی کوئی ایک قابلیت کافی نہیں ہو سکتی۔ کتنے ہی مختلف رنگ چاہئیں۔ جن سے کمال اور بڑائی کی ایک شاندار تصویر کھینچی جا سکتی ہے۔ دیش بندھو میں یہ مختلف اوصاف اپنی کافی مقدار میں جمع ہو گئے تھے۔ وہ دماغی

اور اخلاقی دونوں طرح کے وصفوں سے مالامال تھے۔ انکی ذہانت غیر معمولی تھی۔ انکی رائے عجیب انگیز حد تک صائب اور بحث واستدلال کی قوت اعلیٰ درجہ تک دلنشیں تھی۔ ان کا دماغ ایک ایسا سانچہ تھا جو کوئی ٹیڑھی اور ناہموار چیز قبول ہی نہیں کرتا تھا۔ کوئی معاملہ کتنا ہی اُلجھا ہوا ہو، وہ فوراً صاف اور صحیح پہلو پا لیتے تھے۔ اور پھر کج بحث مخاطب کتنا ہی اُلجھائے، ان کا دماغ متاثر نہیں ہوتا تھا۔ انکی قوتِ تقریر میں نہ تو صرف نظر فریب فصاحت ہوتی تھی۔ نہ صرف خشک استدلال، بلکہ خطابت (آریٹری) کے یہ دونوں ضروری عنصر اپنی مناسبت کے ساتھ مرکب ہوتے تھے۔ اور جیسا کہ یونانی مقرروں کا مقولہ ہے، ایک مقرر کیلئے سب سے بڑا وصف یہی ہے۔ کہ ان دونوں عنصروں کی ترکیب میں بے اعتدالی سے محفوظ رہے۔ انکے دماغ سے کہیں زیادہ اُن کا دل مالامال تھا۔ حب الوطنی کے شعلوں سے انکے دل کا تنور ہمیشہ گرم رہتا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں بھی ایک جلتی ہوئی چتا تھے۔ انکی فیاضی اور ایثار جنس کی بے پایاں ہمدردی کا سبب نے بطور ایک مسلم واقعہ کے ذکر کیا ہے۔ انکی فیاضی علماء اخلاق کے نزدیک اسراف سمجھی جائے گی۔ سب جانتے ہیں کہ انہوں نے لاکھوں روپیے کمائے۔ لیکن جب قانونی پیشہ چھوڑا۔ تو رہنے کا مکان گرو تھا۔ اور بمشکل چند ہزار روپیے خرچ کیلئے پاس رہتے۔ انکے ایثار اور قربانیوں کا ذکر محتاج بیان نہیں انہوں نے وطن کی خدمت کے لئے سچ مچ کو زندگی کی ساری آسائشیں قربان کر دیں۔ وہ کلکتہ کی اعلیٰ آسائش پسند سوسائٹی کی شاندار زندگی ترک کر کے کھدر کی ایک چادر پر قانع ہو گئے تھے!

اُن کے یہ تمام اوصاف آج موافق مخالف سب کی زبانوں پر ہیں۔ لیکن میں

صرف اتنے ہی پر قانع نہیں ہو سکتا۔ میں اس سے بھی زیادہ کوئی بات معلوم کرنی چاہتا ہوں۔ یہ اوصاف بلاشبہ غیر معمولی ہیں لیکن ایسے نہیں ہیں جن میں دوسروں کا حصہ نہ ہو۔ ہندوستان اس وقت رہنماؤں اور رہنماؤں کی قابلیت رکھنے والوں سے خالی نہیں ہے۔ اس کے رہنماؤں کی صف کافی طویل ہے۔ ان میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو بجا طور پر ان اوصاف کا کم و بیش دعویٰ کر سکتے ہیں۔ پس ہمیں صرف اسی حد تک رُک نہیں جانا چاہئے۔ ہمیں جستجو کرنی چاہئے کہ اُن کے رہنمایانہ خصائص کے وہ خاص اوصاف کیا تھے۔ جن کی وجہ سے انہوں نے اتنے قلیل عرصہ میں ایسی ممتاز کامیابی حاصل کرلی؟

دو وصف

میرے خیال میں انکے دو خاص وصف ایسے تھے۔ جن میں اُنکی رہنمایانہ زندگی کی کامیابی کا راز پوشیدہ ہے۔ میں ان دو وصفوں کو اُنکی ساری قابلیتوں میں اُبھرا ہوا دیکھتا ہوں:

اول یہ کہ ان کے اندر ایک نڈر اور بے باک قوتِ عمل موجود تھی۔

ثانیاً یہ کہ انکی حب الوطنی اور قومیت فرقہ وارانہ جذبات سے پوری طرح پاک و صاف تھی۔

یہ دو باتیں کہنے میں بہت معمولی ہیں لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ انہی دو وصفوں کے اندر ایک ہندستانی رہنما کیلئے آج سب سے بڑی آزمائش مضمر ہے میں خیال کرتا ہوں۔ دوسرے وصف کے بغیر تو ہندوستان جیسے ملک میں سچی

حُبُّ الوطنی اور قومیت کا نشوونما ہو ہی نہیں سکتا

نڈر اور بے باک قوتِ عمل سے میرا مقصود یہ ہے۔ کہ ہم میں ایک بے باک اور خطرہ میں کود پڑنے والے سپاہی کی طرح کام کرنے کی رُوح موجود ہو۔ جو بات ہمارے اعتقاد میں سچی اور ضروری ہو، بغیر تامل اور تذبذب کے کہنے اور کر بیٹھنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ بہت زیادہ سوچنا، دیر تک مذبذب اور متردد رہنا، قدم اُٹھانا اور پیچھے ہٹا لینا، طرح طرح کے نقشے بنانا اور چاک کر دینا، ایک مفکر یا تھینکر کیلئے بہترین اوصاف ہوں۔ لیکن ایک قائد لیڈر کیلئے نہ صرف غیر ضروری بلکہ میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں۔ کہ بسا اوقات عیوب میں داخل ہیں۔ ایک قائد کی راہ ایک فلاسفر کی راہ سے مختلف ہوتی ہے۔ قائد میں تخیل سے زیادہ عملیت ہونی چاہئے۔ اُسے ہم حکیم سے نہیں مگر سپہ سالار سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ ایک سپہ سالار اگر نقشۂ جنگ سوچنے میں ایک مفکر کی طرح غرق ہو جائے؛ تو میدانِ جنگ کیلئے یقیناً کوئی دوسرا جنگ آزما ڈھونڈھنا پڑے گا۔ نپولین نے جنگ مرنگو کا نقشہ ضرور ترتیب دے لیا تھا، لیکن کوہ الپس کی ناقابلِ عبور چوٹی سے جب فرانسیسی فوج گزر گئی۔ تو یہ اُس کے دماغ کا نہیں۔ اس کی بے باک شجاعت و ہمت کا کام تھا!

چترنجن داس کے اسی وصف کا مجھ پر خاص طور پر اثر ہے۔ ممکن ہے وہ سوچنے میں سست ہوں، لیکن کر گزرنے میں بے دھڑک اور بے باک تھے۔ کوئی معاملہ کیسا ہی بحث طلب اور پیچ در پیچ کیوں نہ ہو۔ وہ فوراً ایک فیصلہ قائم کر لیتے اور پھر بے دھڑک چل کھڑے ہوتے تھے۔ جھجک اور تذبذب کو اُن کی سیرت (کریکٹر) میں جگہ نہیں ملی تھی۔ عملی سیاست میں دسمبر

بات کے قائل نہیں تھے۔ کہ انتظار کرو۔ اور سوچو۔ جو پتھر راستے میں آجائے۔ اسے فوراً ہٹا دینا چاہئے۔ اور رکنا نہیں چاہئے۔" یہی اُنکے سفر کا دستور العمل تھا۔ شکسپیئر نے ہملٹ میں انسانی دماغ کی وہ حالت بتلائی ہے۔ جب وہ حیران ہو کر سوچتا ہے کہ "دوں یا نہ کردوں؟" "یہ کروں یا نہ کروں" ان میں نہ تھا!"

ان کا دوسرا وصف بھی ایک طرح اسی وصف کے ساتھ بیان کیا جا سکتا ہے ہندوستان کی قومیت کی راہ میں سب سے زیادہ مشکل روک ہندو مسلم مسئلہ کی پیچیدگیاں ہیں حالات ایسے گہرے اور شدید ہیں کہ بسا اوقات ایک بڑے سے بڑا ہندو وستانی محب الوطن بھی فرقہ وارانہ تنگ نظری سے اپنے دماغ کی نگہبانی نہیں کر سکتا۔ بڑی ہی ہمت، عشق وطن اور جنون آزادی کا بڑا ہی طاقتور جذبہ چاہئے۔ جو ہمیں ایسی بلندی پر پہنچا دے۔ جہاں تک ان نچلے جذبات کی رسائی نہ ہو۔ میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔ کہ چترنجن داس نے ایسی بلندی حاصل کر لی تھی۔ اور وہ کسی حال میں بھی اس سے اترنے کیلئے طیار نہ تھے۔ اس بارے میں اُن کا دل فراخ اور فیاض تھا۔ وہ ملک کی آزادی اور نجات کے لئے وہ ساری چیزیں قربان کر دینے کیلئے طیار تھے۔ جو اس اعلیٰ مقصد سے کمتر درجہ کی ہو سکتی ہیں۔ صرف یہی روح ہندوستان کا مسئلہ حل کر سکتی ہے۔ افسوس کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ مقام اس وقت تک بہت کم ہندوستانی رہنماؤں کو حاصل ہو سکا ہے

میثاق بنگال

ہندو مسلم مسئلہ کے سلسلے میں "میثاق بنگال" (بنگال پیکٹ) ان کی زندگی کا

مشہور واقعہ ہے۔ اس پر موافق مخالف، دونوں طرح کی رائیوں کا نہایت پرجوش مظاہرہ ہو چکا ہے۔ لیکن اس وقت تک بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا۔ کہ یہ میثاق وجود میں کیونکر آیا تھا؟

جن لوگوں کو ہندو مسلم مسئلہ کی عملی مشکلات کا علم ہے، وہ جانتے ہیں۔ کہ معاملہ کس درجہ مشکل اور پیچیدہ ہے؟ معاملہ کی کوئی جانب اختیار کی جائے، ضروری ہے کہ مشکلوں اور مزاحمتوں کا ایک طوفان عظیم سامنے آجاتے۔ گزشتہ فروری ۱۹۲۸ء میں دہلی کی آل پارٹیز کانفرنس نے کامل ایک ہفتہ تک نشست جاری رکھی۔ لیکن بالآخر کیا ہی فیصلہ کے منتشر ہوگئی۔ ایسا مشکل اور ہمت آزما معاملہ جب اس دیش بندھو کے سامنے اچانک آگیا۔ تو انہوں نے کیا کیا؟ میں پہلی مرتبہ لوگوں کو بتلانا چاہتا ہوں۔ کہ صرف پانچ منٹ کے اندر فیصلہ کر دیا!"

یہاں میں نے پانچ منٹ تھوڑے وقت کے معنی میں مجازاً استعمال نہیں کیا ہے۔ بلکہ سچ مچ گھڑی کے پانچ منٹ مراد ہیں۔ بنگال لیجس لیٹو کاونسل کے انتخاب ۱۹۲۳ء سے جب ہم فارغ ہوئے، تو مخالفین نے کانگریس کو ناکام رکھنے کے لئے ہر طرح کے ہتھیار آزمانا شروع کر دیئے۔ ان میں سب سے زیادہ مؤثر اور آزمودہ ہتھیار فرقہ وارانہ حقوق کا مسئلہ چھیڑ دینا تھا۔ اس وقت کاونسل کے اندر اور باہر، دونوں جگہ جماعت کی کامیابی بہت کچھ اس پر موقوف تھی۔ کہ مسلمان کیا طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں؟ جیسا کہ معلوم ہے، مسلمان دو جماعتوں میں منقسم تھے۔ ایک جماعت کانگریس کے ساتھ تھی، ایک باہر۔ کانگریس کی کوشش تھی۔ کہ تمام مسلمان کانگریس کا ساتھ دیں۔ مخالفین کوشش کر رہے تھے کہ

ہندو مسلم مسئلہ چھیڑ کر انہیں اس سے باز رکھا جائے۔ اس اثنا میں وہ ایک عجیب چال چلے۔ انہوں نے ممبران کاونسل سے کہا۔ کہ اگر کانگریس پارٹی میں شامل ہی ہونا چاہتے ہو۔ تو کم از کم اس کا فیصلہ کر لو۔ کہ مزید سیاسی حقوق ملنے پر مسلمانوں کی نمایندگی کا کیا حال ہوگا؟ یہ انہوں نے اس لئے کہا۔ کہ ان کا خیال تھا مسلمانوں کی جانب سے جو مطالبات پیش ہونگے، انہیں کانگریس پارٹی منظور نہ کر سکے گی نتیجہ یہ نکلے گا۔ کہ مسلمان مایوس ہوکر الگ ہو جائیں گے، اور مسلمانوں کی علیحدگی کے بعد کانگریس پارٹی نہ تو کاونسل کے اندر کچھ کر سکیں گی۔ نہ باہر مضبوط ہو سکیں گی۔

چنانچہ مسلمانوں کے مطالبات کی ایک فہرست ایک بڑے سرکاری افسر کے یہاں طیار کی گئی۔ اچانک ایک دن صبح مجھے معلوم ہوا۔ کہ آج مطالبات پیش کئے جائیں گے۔ میں نے اسی وقت مسٹر داس سے بذریعہ ٹیلی فون گفتگو کی۔ میں نے دریافت کیا۔ کہ اگر یہ مطالبات پیش ہوئے۔ تو آپ کا طرز عمل کیا ہوگا؟ انہوں نے بلا کسی تامل کے جواب دیا۔ "میں فوراً منظور کر لوں گا کوئی وجہ نہیں۔ کہ معقول مطالبہ منظور نہ کیا جائے۔ اگرچہ بے موقع پیش ہوا ہو" یقیناً انہوں نے یہ فیصلہ پانچ منٹ سے بھی کم میں کر دیا تھا!

اس طرح ایک سخت خطرہ سے فوراً نجات مل گئی۔ البتہ ایک دوسرا خطرہ پیدا ہوگیا یعنی مخالف کا وہ طوفان عظیم جو اس کے خلاف شروع ہوا لیکن اس کے فرو کرنے کے لئے بھی ہم اس وقت کافی طاقتور تھے۔

کارپوریشن کی میئرشپ

شاید کلکتہ سے باہر بہت کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہوگئی۔ کہ جب

کارپوریشن کلکتہ کے پچھلے انتخابات میں کانگریس کو کامیابی ہوئی، اور کارپوریشن کے پہلے میئر کے انتخاب کا مسئلہ پیش آیا، تو مسٹر داس بالکل طیار نہ تھے کہ خود میئر منتخب ہوں۔ پہلی مرتبہ جب اس بارے میں مجھ میں اور اُن میں مشورہ ہوا، تو انہوں نے زور دے کر کہا: "میں چاہتا ہوں پہلا میئر ایک مسلمان ہو۔ یہ اس بدرع کا عملی ثبوت ہوگا۔ جو کانگرس پارٹی نے مسلمانوں کی نسبت ظاہر کی ہے۔ اور چونکہ بجز تمہارے اور کوئی مسلمان ایسا موجود نہیں۔ جسے ہم سب بالاتفاق منتخب کرلیں، اس لئے تم اس کے لئے طیار ہو جاؤ۔" اُس وقت تک الڈرمین کا انتخاب بھی نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے پانچ الڈرمین میں ایک نام میرا اسی غرض سے رکھا تھا۔ تاکہ مجھے میئر منتخب کیا جا سکے۔

لیکن میں نے نہایت اصرار کے ساتھ اس سے اختلاف کیا۔ میں نے کہا جہاں تک میری ذات خاص کا تعلق ہے۔ میں نہ تو اب اور نہ کبھی آیندہ اپنے آپ کو ان مناصب کے لئے مستعد کر سکتا ہوں۔ میری زندگی کی رفتار ابتدا سے دوسری ہے۔ وہ کسی طرح ان مناصب کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی۔ باقی رہا کسی مسلمان کا میئر ہونا۔ تو بلاشبہ مسلمانوں کو پوری کشادہ دلی کے ساتھ موقع دینا چاہیئے لیکن اس وقت ہر اعتبار سے ضروری ہے۔ کہ آپ ہی میئر منتخب کئے جائیں خود مسلمانوں کی بھی خواہش یہی ہے۔

میرا ان کا باہمی تعلق

میں چند الفاظ اپنے اور اُن کے باہمی تعلقات کی نسبت کہے بغیر نہیں رہ

سکتا۔ اُنکی برادرانہ محبت کی یاد میرے دل کا ایک ناقابلِ اندمال زخم ہے۔ ہمارا ایک دوسرے سے تعارف سوسائٹی میں نہیں ہوا۔ نہ ہم میں اور کسی طرح کا ذاتی تعلق تھا۔ محض قومی خدمت کے سلسلہ میں ایک دوسرے سے روشناس ہوئے لیکن طبیعتوں کی مناسبت نے بہت جلد دلی علاقہ کی صورت اختیار کرلی حتیٰ کہ ہم محسوس کرنے لگے کہ دو بھائیوں کی طرح ایک دوسرے سے منسلک ہو چکے ہیں۔

۱۹۱۷ء سے پہلے ان کی شہرت زیادہ تر بہ حیثیت ایک کامیاب بیرسٹر کے تھی۔ اسی سن میں وہ پبلک پلیٹ فارم پر نمایاں ہوتے۔ میں اس وقت نظربند ہو چکا تھا۔ اور رانچی میں مقیم تھا۔ اخبارات میں ان کی سرگرمیوں کا حال پڑھتا رہا۔ جنوری ۱۹۲۰ء میں جب رہا ہو کر واپس آیا تو پہلی مرتبہ اُن سے شناسائی ہوئی۔ ایک دعوت میں جو مجھے دی گئی تھی وہ بھی شریک تھے۔ لیکن یہ شناسائی محض سرسری تھی۔ اس کے بعد ہی "نان کوآپریشن" کی تحریک کا ابتدائی زمانہ شروع ہو گیا۔ اور اگست میں کانگریس کا خاص اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا۔ اس موقع پر وہ اس نظام عمل سے متفق نہ ہو سکے۔ سال کے آخر تک مخالف رہے۔ اور اسلئے یہ زمانہ ہم دونوں نے باہمی مخالفت میں بسر کیا۔ وہ ناگپور کانگریس کے لئے مخالفانہ طیاریاں کر رہے تھے۔ میری کوششیں موافقانہ تھیں۔

ناگپور کانگریس میں وہ اس لائحہ عمل سے متفق ہو گئے۔ اور پھر ہم دونوں از سرِ نو ملے تاکہ بنگال کے کاموں کی نسبت مشورہ کریں۔ فی الحقیقت

اسی زمانہ سے میرے اُن کے تعلقات کا اصلی زمانہ شروع ہوتا ہے۔ اس تاریخ سے لے کر اُن کے انتقال تک میرا ان کا شب و روز ساتھ رہا۔ روز بروز باہم ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے گئے۔ انہیں مجھ پر اعتماد تھا۔ اور میرے دل پر ان کی خوبیاں نقش تھیں۔

باہمی تعلق کا یہ زمانہ کچھ عجیب گوناگوں حالات میں بسر ہوا۔ اس میں دسمبر ۱۹۲۱ء کا وہ یادگار وقت بھی شامل ہے۔ جب سب سے پہلے بنگال میں "سول ڈس اوبیڈینس" کا قدم اُٹھایا گیا اور دو ہفتہ کے اندر اُس نے حکومت کو مجبور کر دیا کہ سختی و مقابلہ کی جگہ صلح و آشتی کا ہاتھ بڑھائے۔ اس زمانہ میں ہم رات کے دو دو بجے تک اکٹھے بیٹھتے، اور دوسرے دن کا پروگرام تجویز کرتے۔ ۹ دسمبر ۱۹۲۱ء کو ہمیں معلوم ہو گیا۔ کہ اب ہماری گرفتاری میں تاخیر نہیں کی جائے گی۔ اس دن رات کے گیارہ بجے مسٹر کیرن شنکر رائے کے مکان پر ہمارا آخری اجتماع ہوا، اور دوسرے روز سہ پہر کو بہ یک وقت گرفتار کر لئے گئے۔ قید خانہ میں بھی ہماری یکجائی قائم رہی۔ البتہ اُنہیں چھ ماہ کی سزا دی گئی تھی۔ مجھے ایک سال کی۔ اس لئے وہ مجھ سے ۶ ماہ پہلے رہا ہو گئے۔

۱ جنوری ۱۹۲۳ء کو جب میں رہا ہوا، تو کانگریس دو جماعتوں میں بٹ چکی تھی۔ اور نئی سوراجیہ پارٹی کے لیڈر مسٹر داس تھے۔ دونوں جماعتیں مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھیں۔ لیکن میں کسی میں بھی شریک نہیں ہوا، اور اپنا وقت تمام تر اس کوشش میں صرف کر دیا۔ کہ کسی طرح یہ اختلاف دور

ہو جائے۔ یا کم از کم ایسی شکل اختیار کرلے کہ کانگریس کی مجموعی طاقت باہمی جنگ وجدال میں ضائع نہ جائے۔ چونکہ دونوں طرف جماعت بندی کے شدید جذبات کام کر رہے تھے، اور متحدہ نقطۂ عمل اپنی جگہ سے ہٹ چکا تھا اس لئے قدم قدم پر مشکلات پیش آئیں۔ بالآخر کامل آٹھ ماہ کی جد وجہد کے بعد مجھے اپنی کوشش میں کامیابی ہوئی۔ اور دہلی کے خاص اجلاس کانگریس میں ایک متفقہ فیصلہ ہو گیا۔

اس کوشش کے اثنا میں مسٹر داس کا جو طرزِ عمل ظاہر و باطن رہا اس نے میرے دل پر انکی غیر معمولی صفات کا اثر اور زیادہ گہرائی کے ساتھ نقش کر دیا۔ میں اس کام میں بہ حیثیت ایک صلح جو (پیس میکر) کے مجبور تھا کہ حسب ضرورت دونوں طرف رد وکد کروں، اور کبھی ایک جماعت کو دباؤں کبھی دوسری کو۔ بارہا ہم میں نہایت تیز اور سخت بحثیں بھی ہو گئیں۔ مجھے جس طرح "نو چینجرز" کے جمود وتقلید سے اختلاف تھا۔ اسی طرح "پرو چینجرز" کی بے قیدی سے بھی متفق نہ رہا۔ با ایں ہمہ ان تمام حالات کے اندر بھی جو حقیقت برابر مجھ پر کھلتی گئی، وہ بہ حیثیت ایک سیاسی قائد اور مدبر کے مسٹر داس کی شخصیت تھی۔

جہاں تک ہندو مسلم مسئلہ کا تعلق ہے، میرا ان کا معاملہ کچھ عجیب طرح کا تھا۔ میں ڈرتا ہوں۔ کہ ملک کی موجودہ آب وہوا میں بہت کم لوگ اُسے ٹھیک طور پر سمجھ سکیں گے۔ ہم جب کبھی اس طرح کے معاملات پر گفتگو کرتے تھے، تو بلا مبالغہ ہمیں ایک ادنیٰ احساس بھی کسی طرح کی تفریق

کا نہیں ہوتا تھا۔ بارہا وہ کسی معاملہ میں ہندوؤں کی کسی جماعت کے نقطۂ خیال کے خلاف رائے دیتے۔ اور میں مسلمانوں کے کسی گروہ کی رائے میں متفق نہ ہو سکتا۔ میرے دل میں کبھی یہ گمان بھی نہیں گزرتا۔ کہ ان میں میرے ہم مذہبوں کے خلاف کوئی فرقہ دارانہ جذبہ ہے۔ اسی طرح وہ بھی کبھی اس کا خیال نہیں کر سکتے تھے۔ کہ میری حق پسندی فرقہ دارانہ خود غرضی سے آلودہ ہو سکتی ہے۔ وہ تمام معاملات جو آج ملک میں فرقہ دارانہ نزاعات کا ایک طوفان برپا کر دیتے ہیں، ہمارے سامنے آتے تھے، اور ہم اس آسانی کے ساتھ فیصلہ کر لیتے تھے۔ کہ ہم دونوں کے علاوہ کسی تیسرے کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوتی تھی۔ بارہا ہم نے ایک دوسرے سے یہ سوال کیا۔ کہ کیا تمام ملک کے اندر دس بیس انسان بھی ایسے پیدا نہیں ہو سکتے۔ جو اسی طرح انصاف اور حق پسندی کے ساتھ ہر معاملہ پر نظر ڈالیں؟